شاعری

چار پرنگ

عبدالرشید

چار پرندے

بیدل لائبریری کے لیے
اجمل کمال کا عطیہ

عبدالرشید

سانجھ

کتاب	:	چار پرندے
مصنف	:	عبدالرشید
اشاعت	:	جون 2008ء
تعداد	:	300
مطبع	:	شرکت پریس، لاہور
قیمت	:	140

ISBN: 978-969-8957-40-7

دوسری منزل، مفتی بلڈنگ، 17/31 ٹیمپل روڈ، لاہور
فون: 042-7355323
e-mail:sanjhpk@yahoo.com

محمد خالد کے لیے

Poem, you sonofabitch, it's bad enough
that I embarrass myself working so hard
to get it right even a little,
and that little grudging and awkward.
But it's afterwards I resent, when
the sweet sure should hold me.
There should be at least briefly
access to your glamour and tenderness.
But there's always this same old
dissatisfaction instead.

JACK GILBERT

ترتیب

چھونا چاہا

چھونا چاہا
ہاتھوں کے معصوم پنے نے چھونا چاہا
چھونا چاہا چھونے کی لذت کی خاطر
دنیا کا اک ایسا روپ جو کہیں نہیں ہے

چھونا چاہا چھونے کی اس آس کو لے کر
پیڑ پرندے، ان کی کائیں کائیں
نل سے بہتا ریت کی صورت پانی
دوڑتے جاتے قدموں کی آواز سے اڑتے چھلکے

چھونا چاہا چہروں کے پیچھے چہروں کو
جن کی گھات اور خفیہ حربے، جن کا تکلف
کھل کر باہر نہ آیا تھا

اس اک موت سے پہلے چھونا چاہا
اپنے ہی امکان کی حد کو
اپنے ڈھول کے اندر سمٹے پھن کو

بازاروں میں چلتی پھرتی اور جھروکوں میں استادہ
روشن اور مرجھائی شبیہیں
عمروں میں اور قد میں اور احساس میں بالغ

دن کی گانٹھ کو دن سے باندھا
اس امید میں کینہ ہے یا خواہش
اس میں دبی رہے گی

محفوظ پنہ کی جانب لپکے
دامن کے کونوں کو تھامے
جیسے بوسے نہ ہوں باسی روٹی کے ٹکڑے ہوں
گود میں گرنے والے

آنکھیں آنگن بن کر کھلی ہوئی ہیں
بستر میں کوئی سورج ہے نہ جیب میں تھیلی
پیڑ سے گرنے والے پھل سخاوت ہیں

ہاتھ سلامت ہیں کہ دوری ناپ رہا ہوں
پیر سلامت ہیں کہ لوٹ کے واپس بھی آنا ہے
پر لفظ بلوغت اور بلاغت کے مابین کہیں بھٹکے ہیں

جاگتی آنکھیں ذہنی بینائی میں سمٹی
کاغذ قلم سیاہی جیسے گُند اوزار
دیکھ رہی ہیں

اس اثنا میں زندہ رہنے کے پتھر کو توڑیں
یا خود میں موت کو کھودیں
افواہوں کے پس منظر میں دنیا کھسک رہی ہے

چھونا چاہا کثرت سے بیداری سے یکسوئی سے
خود کو اذیّت دینے والے مکتوبات
ان میں پھیلی لفظوں کی لب تشنہ جونکیں

ان مُردوں کو جو مجھ میں دفن رہے ہیں
جن کی تلخ کلامی نیندوں کی نگراں ہے
جو شب کی دست بدبستہ عرضی پھاڑ چکے ہیں

چھونا چاہا گھات میں سنگ وخشت کی آنکھیں
بعد از پھانسی رسّی اور تختوں کی اداسی
جس سے نامعلوم خوشی کے چھلکے
اُترے اور منظر پر پھیلے ہیں

چھونا چاہا قینچی سے ناراض دلوں کو
بارش کے قطروں میں کھلتے گردو پیش کے منظر کو
اس کی نسواں محبوبیت کو

چھونا چاہا ان چڑیوں کو
تنہائی کی شاخوں کو جو پھدک پھدک کر
کاٹ رہی ہیں

چھونا چاہا موسم کے منظورِ نظر پھولوں کو
ان کی باس کے پہناوے کو
ان کے درجہ بہ درجہ حیراں کرنے والے
لغت میں کثرت سے ناموں کو

روشن چہرے اینٹوں کی دیوار پہ لرزاں ہیں
ابھرے ہونٹوں کی دعوت میں
نخوت بھی ہے عریانی بھی شیرینی بھی

آندھی کی یلغار
بدن کے خطوں کو برسات میں ٹھکا پا کر
سختی سے جھنجوڑ گئی ہے

رات اور دن کے کوچے گویا گود تھے یا فرنیچر
اس میں جمے رہے، دنیا زاد کی خصلت
وہ دارو تھا جس کو پینا ہی پڑتا تھا

اپنا آپ سنبھالا باطن میں اس بیج کو
پانی دے کر، جو آدم خور کی شکل بڑا ہوا ہے
اور زرخیز بدن کا متلاشی ہے

عرض طلب کی ناسمجھی یا خواہش کے
اس بھید اور بھاؤ کی بھول بھلیاں
جو رومان کا محور بنی رہیں

جینا استغراق تھا لیکن مرنے کی تیاری نہیں تھا
ہوش دلاور تھا مگر پھر آگ پہ ننگے پیروں
چل کر خودسوزی سے جھجکا تھا

چھونا چاہا چھریوں سے تلوار سے خنجر سے تیروں سے
پیشہ ورانہ اُنس، رقابت
انکار سے جڑواں مات، علالت

بعد از جفتی جسموں کی خوشحالی
جن کے اوپر گردش کرتی نیندوں کی یلغار
شکلوں کی تنسیخ کیے جاتی ہے

چھونا چاہا آدم اور حوا کے پہلے دن کے پہلے بول
پہلی محبت کے انجام کی پر اسرار خموشی
جب لفظوں نے جنم لیا تھا جڑنے کی ترکیب کے ساتھ
اور آنے والے دنوں کے دور اندیشی کی رکھوالی بھی

کوّے اور قابیل کی نسبت سے مٹی کو کھودتے رہنا ہے
روزانہ کی یہ جبری مشقت اور ریاضت
قید میں شنوائی کے دن تک کرتے رہنا ہے

اور یہاں تاریکی میں اب ہاتھ ہلاتے رہنے سے
جو شکلیں اپنے جسموں کی پہچان سے زائد نکلیں
وہ آسیب بنی ہیں

اک اندھے پن نے صفر کا چولا پہنا ہے
اک جلتے شوق نے اپنی آگ سے مٹھی بھر لی ہے
اک آندھی غم کا بھیس بدل کر چلتی رہتی ہے

جنگ ہے یا معمول کی مشقیں
ماہر تیر انداز کی صورت
گھر سے باہر نکلے ہیں

ایک صدی کی فیئری ٹیل کا حاصل
جنگوں کا رومان اور اس کے تجزیے کی داد
جس سے بصری اور سماعی بشریت تشکیل ہوئی

جو سوچا قسطوں میں سوچا اور مکمل خبریت
کے اجزا سے محروم رہے، تصویر کا دھندلا خاکہ اُبھرا
تقریر کے اور تحریر کے فنی پہلو سے ہم ہار گئے

چالیس برس سے جو بے ہوشی طاری ہے
نیند نہیں کہ جس کی کھاد کو الٹیں یا جگراتا
جس کی دلدل سے محبوس نکلنا چاہیں

ہم سرکس کے کردار نہیں ہیں، ذیلی خدمت گار
اس مفروضہ رول کی نصف صداقت کے بل بوتے
پردہ اٹھانے اور گرانے والے ہیں

یادیں جو پردوں کے پیچھے پردوں میں
جالوں کے پیچھے جالوں میں
لامتناہی اور بے ربط تناظر میں پھیلی ہیں
ان جذبوں کی اب اصلی شکلیں بھی کمیاب ہوئی ہیں

خود ہی پیر کی بیڑی تھے نہ کھول سکے
اب پابجولاں رومیؔ والے گردش کے حلقے میں
اونگھ اور مستی کے مابین کہیں پر گھوم رہے ہیں

چھونا چاہا الف سے لے کر ے تک
شوق کی سفلی پرتوں کو ان رستوں کو
قاتل اور مقتول جہاں آ ملتے ہیں

کوئی گولی سے گرتا ہے بھوک سے آبروریزی سے
ہم اُجرت پر ماتم کرنے والے ہیں
ہر صدمے کی تصویر بنا کر اس کو بھینچ کے رکھتے ہیں

چھونا بچھو کا ہتھیار ہے اس کی حکمت ہے
جینے مرنے کے آداب میں یکسانیت ہے
کردار حقیقی یا فرضی ہوں

یہ بھی اک مفروضہ سٹیج

یہ بھی اک مفروضہ سٹیج
مانگے کے منظر کے آگے
لفظوں کی بھرپور کمک سے
دام کی صورت داؤ لیے
جذبوں کی متروک لغت کے قاری

سروں کا جنگل، سر ہی سر
اسموں اور ناموں کا جنگل
گننے کی اور چھونے کی اور شجرہ بنانے کی
وہ ازلی پیاس

جہاں کے آگے زخموں کو اور خوابوں کو
تلوار کی صورت ننگا کر کے پھرنا
یہ تکرار اعادہ اور اصرار
زخموں کو چھونے کی اور چکھنے کی دعوت

دو ہی لفظ تھے، دونوں کے مابین
فسانے کی کڑیاں تھیں
ہر پہچان کا پانسہ جوئے کا پانسہ تھا

نظریں منظر کی ترتیب اخذ کرتی ہیں
وقت اور مال اور قیمت کی نسبت سے
پردے کے گرنے سے پہلے
بنیے جیسا جانچ رہی ہیں

اک ہنگامہ، لیکن دردِ سر
جو خود پر بیتی وہ تو بیت چکی ہے
چاہیں نہ چاہیں بولی لگانے والے
پیچھے پیچھے چلتے ہیں

لفظوں سے آلودہ کاغذ ذہنوں میں پوشیدہ
اس خاکے کی تجرید نہیں، جن کو ایسے اسموں سے
مانوس کیا جاتا ہے، جن کے اپنے تشخص
کو بھی استدلال کی حاجت ہے

تھیٹر یا تاریک پنہ آغوش کی صورت
خود کو بُننے والی چاہت لے کر گھات میں بیٹھے
لفظوں کی خوراک سے ،گریاں چنتے ہیں

اپنے پن کی تنہائی پر گردش کرتے
منظر کی تاویل کی ہر کوشش پر
غالب آنے کی تسکیں سے
اپنی ہی تصدیق کی جانب بڑھتے ہیں

دن کے شیشے کو مَل مَل دھوتا ہوں
اس میں سال و سن کے نیزے گڑے ہیں
اس میں الفت کی شاخوں سے پانی
گر کر سُوکھ چکا ہے

یہ بھی اک مفروضہ سٹیج
چاہے خود سے بات کریں یا اوروں سے
اک وہم و گماں سا رہتا ہے
جو کچھ بیتا اس میں کتنا سچ ہے
کتنا برائے زیبائش ہے
کتنا اس میں طرزِ کلام

آرزو اور آرزو کے ہم سفر

آرزو اور آرزو کے ہم سفر
جو بھی تھے معصوم تھے، بچھڑے جدائی کی طرح کا
درد سینے میں لیے

زندگی جو بھیس بھی تھی اور نقالی
قدم چلتے تھے ایسے راستوں پر جن کی وحشت
جن کے حال و قال کا وہ لا ابالی پن

بھروسے سے جدا تھا، دیکھتے تھے کس تمنا سے
دنوں کے پھیلتے آنگن، خزاں کی سہ پہر اس کی اداسی
اور دلوں میں چوٹ کی صورت رفاقت

پہلا ناتکمیل بوسہ
جو خلش بن کر رہا، وہ چوری چوری اپنی عریانی
کا تنہا جائزہ، خود کو مسلتے ہاتھ

جو دنیا کے اس انگور کے شیرے سے لتھڑے
اور کتابوں سے وہ محبوبانہ دلچسپی ہم آغوشی
شبوں کو قرض کی مے کا خمار

اور کہانی کی طرح کروٹ بدلتے
رات دن کاغذ کے صفحوں کی طرح سے کھلتے جاتے
جیسے قصے میں کئی پیوست ہوں قصے

کبھی آزردگی کی گرد جو نانِ جویں تھی
خشک اور بد ذائقہ اس کا طعام......
یا بدن میں مسترد خوابوں کی الجھن

یوں مہم جُو بن کے ابھرے رات کی تصویر پر غالب
خلا کے روبرو انکار کی ہرزہ سرائی
گفتگو کے بیچ آندھی کی طرح اڑتے رہے

دل میں لیکن چور تھا دنیا کی اس تعبیر کے پردے کے پیچھے
ذہن کو اکسا رہا تھا، روشنی تھی یا کہ تاریکی
مگر ایسے سوالوں کی مہک جو روح میں ناسور بن کر جم گئے

ایسے سوالوں کا بیاں جو آئنے سے لفظ بن سکتے
مگر لفظوں کے پیمانوں سے باہر ہی ڈھلک آئے
ندامت کی طرح ان کو چھپا کر شہر کی سڑکوں پہ

خالی گشت کرتے اور روایت کی طرح
اپنا گریباں پھاڑ کر پھرتے رہے
دوستوں اور دشمنوں کی بھکی نظریں

سانجھ کے لمحوں میں ٹکرائیں مگر اس جال سے باہر
ہی سرگرداں رہیں، پھر اپنے اپنے حوصلوں سے
پست ہو کر راستہ تبدیل کر کے مڑ گئے

دسترس کی بات کیا، دسترس میں کیا نہیں تھا اور کیا
جانچتی نظروں میں شب خوں کی لپک تھی
گھات میں بیٹھے شکاری کا بھی خوف

پَیر چلتے تھے مگر یہ وہم تھا
ہم راستہ بھٹکے ہوئے ہیں
چار دن کے تجزیے پر زندگی کا داؤ ہے

زندگی اُلجھی ہوئی باتوں کی وہ زنجیر جس کی اک کڑی سے
دوسری کڑیاں صدا دینے لگیں
احساس جو حرف وسخن سے ماورا ہے

یوں بہانہ ڈھونڈتے تھے واپسی کا
اور مٹانا چاہتے تھے اپنے قدموں کے نشاں
تعطیل کی فرصت کی اس کو بھول سمجھیں یا اسے

اک رات کی ہم بستری جس کا نشہ آزار بن کر رہ گیا
سودائی پن جو ہوش کی شرطوں کی اُجرت پر رہا
یوں زیاں کی پٹڑیوں پر چلتے چلتے آنکھیں دھندلی ہو چکی تھیں

ذہن خالی، پیڑ برگ و بار سے محروم، ایسے دن مہینے
سختیاں، عُسرت کی لعنت، ہر کسی سے بے وجہ
مشروب میں سنگت، زبوں حالی کی تلخی، چاکری

آخر تو یہ ہونا ہی تھا
اجنبیت بدمذاقی کی طرح
لفظوں سے رشتوں کو کہاں تک جوڑ کر رکھتی

مڑے اور واپسیں قدموں سے ان اہداف کی جانب چلے
ہم جنھیں جوشِ جوانی میں کبھی رد کر چکے تھے
دوستوں سے آج ملتے ہیں تو شرماتے ہوئے

گفتگو میں پہلی جیون ہار رونق کھو چکی ہے
اپنی اپنی یاد کی کمزوریوں کے روبرو اور منفعل ہیں
اپنے گرد و پیش کے جذب و اثر میں کھو چکے ہیں

اور اب اتنی سی دِقّت ہے
کہ جس دنیا کی پیدائش کے سپنے دیکھ کر
گھر سے برہنہ پا چلے تھے

اس کو اپنے ہاتھ سے اب کس طرح دفنائیں گے
ان کڑے پہروں کی باتیں درد بنتیں، زخم بن جاتیں
تو ان کو خون میں اور روز و شب کے روزنوں میں پالتے
پر وہ بکھر کر محو ہو کر اب تمسخر بن گئی ہیں

زہر بن کر وہ دہن کے آب میں گھل مل گئی ہیں
اور اگرچہ پہلے بھی ناقص تھے اور لاغر بھی تھے، اب
اپنی نظروں میں بھی چھوٹے ہو گئے ہیں

دن نکلا تو پھر بھی چُپ تھا

دنیا تھی یا گچ کاری کی محل سرا
حیرانی سے جس کو تکتے جس سے قوت لیتے
یہ گلیاں اور گلیارے کوچے کسی کتاب کے بکھرے باب
ایک کہانی جو اقساط میں پھیل رہی ہے
وہ رات نہیں تھی نیند کی لمبی چادر تھی جو تان کے سوئے
دور کی اک آواز کی سنگت جس کی مستی
روگ کی صورت اور بڑھاوا دیتی
یوں لگتا تھا شہر کی ساری سڑکوں کو ہم
خواہش کی خطا طی سے پھر بھر ہی دیں گے
کوئی بجھارت ایسی نہیں تھی، نہ بے چاہی رمز
کہ جس کو کھول نہ پائیں
گندم کی فصلوں پر گرے ہوئے مٹیالے پنچھی
اڑنے کی کوشش میں اپنے پَر پھیلاتے
سانپ جو زہرِ زر کی آڑ میں بیٹھے

گھات لگائے، ان سے بھی مانوس رہے
قطرہ قطرہ ان کا زہر سرایت کر جائے گا
اس سے ہی انجان رہے، خود میں چھپنے کو بن باس کہا
اور پڑے رہے
کہاں زمانہ جس کی چال اور رحلت کو، اجناس کے
پیمانے کو، تنقید کی نظروں سے تکتے تھے
کہاں ترانہ مدحت اور مدّاحی جو آپس میں بانٹ کے
قسطوں میں خوش ہونے کی تقریب کا ایک وسیلہ تھی
ہاتھ سے دانہ چگنے والے چھوٹے پرندے، قسمیں تھیں وعدے تھے
موسم کی سختی سے ڈر کر بکھر گئے
میں بارش کا روپ نہیں تھا نہ ہی بندی خانے کے تالے کے پیچھے
اک اک دن کو گن کر ڈھیر لگانے والا
پہرے دار کی وقفے وقفے سے بیزار ہنسی میں شامل
خود پر ہنستا ہوں، اس شہر کو
خواب کا سودا ہے یہ اپنے مزاروں کے چو گرد
حلقہ باندھے ہاتھوں میں کشکول لیے
فردا سے بے مشکل موت کی رخصت مانگ رہا ہے
دعا ہے جیسے گابھن بھینس کا پہلا دودھ
منہ سے لے کر گھٹنوں تک پھیلا ہو
ہاں ہاتھوں میں کشکول نہیں، کشکول کی صورت

دُہرے ہو کر بیٹھے ہیں، تن کو ڈھانپنے والا استر
محنت کی قیمت سے اور حمیّت سے بھی مہنگا ہے
اور مجھ کو بھی سودا ہے میں جو سفری کپڑوں کے تھیلوں کو
باندھ کے رکھتا ہوں، اور گھر کا سارا ساز و ساماں
اوپر کی منزل پر، اور دائیں بائیں وار کے اندیشے سے نگراں
بولتا جاتا ہوں
میرا مونو لاگ خود اپنے آپ کو اوروں کے شر سے
اور ڈر سے چوکس رکھنا ہے
کہاں زمانے کی تاریخ میں اس کے پھیلاؤ میں
مقصد کی تفہیم کے گونا گوں مطالب میں
بھٹکے تھے، اس کے جوہر کے متلاشی اس کے فاعل کرداروں
اور حربوں کے ادراک کے لغوی معنوں کی
پہچان کے پہلے زینے کی جانب لپکے تھے
کہاں ہلاکت کے اندیشے سے اب رستہ چھوڑ کے
پٹڑی پر گم سم چلتے ہیں، جسمانی عدم تحفظ نے
سرمائے کے سیپاروں کی قرأت
اس میں برکت اور پنہ ڈھونڈی ہے، وسطی عمر میں آ کر
یہ پہلا خود کش حیلہ تھا
پھر یوں ہی رفتہ رفتہ دریا برد ہوا، دیمک تھی جو میرے
اندر کی پُستک کو چاٹ گئی

اک مجبوری وہی پرانی معذری

خود کو چھو کر دیکھوں اس میں باقی کتنی حِس ہے

اور باقی ماندہ خواہش کی اس باسی روٹی کو

لقمہ لقمہ کر کے کھاؤں، یا اگل کر باہر پھینکوں

دن نکلا تو پھر بھی چپ تھا، دنیا کی اس گچ کاری کی محل سرا

کی بھول بھلیاں ساری قوّت چوس چکی ہیں

اک بے ادراک سفر کی منزل کوشش سے طے کرنا ہے

باقی جتنے دن جینا ہے اس کا ہش نیں مرنا ہے

چہرے چھلکے ہیں نہ پکے پھل

چہرے چھلکے ہیں نہ پکے پھل
نہ سورج کی قاش کے بکھرے بیج
یا پردے کی بے لوث شبیہ
سو راتوں کی سہلائی ہوئی

میز پہ چمچا کانٹا اور چھری ہے
اور نیپکن میں لپٹا ویزا کارڈ
قہوے کی پیالی کے نیچے خط ہیں
جن کی وداعی سطریں ابھی لکھنی ہیں

پاس ہی سگرٹ کی ڈبیا کے اوپر
کاؤ بوائے کی تصویر
پس منظر میں تمباکو کے
پتوں کا وہ وِسکی رنگ

اس کے نیچے اُن کے مضرِ صحت ہونے کی
مخلص اور معصوم ہدایت

منٹو پاسنگ شو کے سگرٹ پیتا تھا
افسانوں میں زہر اُگلتا
بابو گوپی ناتھ ہو یا کالی شلوار
یا کھول دو کے وہ جملے ہوں
جو گھاؤ بھی ہیں اور شخصی انا پر ضرب
معنوں کی تثلیث میں مبہم اور بلیغ

کیا میں ان لِکھتوں میں اپنی مرضی کے
احوال میں شرکت کر پاؤں گا
یا سرکاری خط و کتابت کی پُرسوز فضا میں
مِسلوں کے انبار کے نیچے
اپنے نو سے چار قفس میں
عرضی کی اِملا کی نظرِ ثانی میں مشغول رہوں گا

عرصے سے بند خواب میں زن آشوئی کی
دیرینہ لذت سے محروم
اپنا سراپا چھونے کی وہ خواہش بھی اور حِس بھی مرتی جاتی ہے

تم دُور ہو تم سے کہنے کی جو باتیں ہیں
روزانہ ان کا حجم بڑھاتا رہتا ہوں
اور آنکھیں عریاں تصویروں کے خاکوں
ان کے ڈھانچوں کو یوں جانچ رہی ہیں
جیسے مستقبل میں ان کی گاہک ہوں
چہرے چھلکے ہیں نہ پکے پھل
نہ کیڑوں کی جراحی سے
ادھ کھائے ہوئے اور کُترے

گنز برگ اپنے انٹرویو میں کہتا ہے
میں بچہ نہیں تھا پورے گیارہ سال کا تھا
میری ماں جو شادی کے کچھ عرصہ بعد
اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھی
دورے کے دوران برہنہ ہو جاتی تھی
اسی طرح کچن میں جا کر کھانا پکاتی
اپنے ہاتھ سے مجھے کھلاتی
اس کے برہنہ پن سے میں کھسیانا ہو کر
کُڑھتا رہتا لیکن اس سے مفر نہیں تھا
کمرے میں بند باپ نہ جانے کتنے سالوں سے
اک لمبی نظم کے مصرعے لکھنے میں مصروف
گھر پاگل خانہ بنتے بنتے بنتا ہے

کاذِش وہ عبرانی لفظ جو روحوں کا روحوں سے
اور جسموں کا جسموں سے میل کا
صوفی منش وظیفہ ہے
اس کی صراحت سینہ در سینہ ہے
جس کی اِملا کے الفاظ بھی
بدلے ہوئے اعداد سے سب مشروط ہوئے ہیں
ایسے سوالوں کی زنجیر سے جو دریا میں اُترا
پھر وہ ابھرا نہیں ہے
ان سرکش دھاروں میں غوّاصی
فقط عُضلات کی اَن تھک کاوش اور بے چینی ہے

شعروں کو پڑھنے سے پہلے اس کا جاپ
وہ کہتا ہے کہ یاروں سے ہم جنسی کا
کوئی نعم البدل نہیں ہے

دن گنتی کے ہندسوں پر اٹکا ہے
ہندسے گیند نہیں ہیں تارے ہیں
جو جلتے بجھتے جلتے بجھتے رہتے ہیں

لامحدود ضیافت کی خواہش کا دستر خوان بچھا کر
زانو تہ کیے بیٹھا ہوں

سوچ رہا ہوں کندھوں سے پَر نکلیں گے
ان کے رعب یا ان کی دہشت سے
فاقہ مستی کے ایام کی مُدت کم ہوگی
یا قید کی مدت بڑھ جائے گی

چہرے چھلکے ہیں نہ پکے پھل
نہ انار کے سودانوں کی بینائی سے روشن
گوٹی ہوئی چاندی کے ایسے ورق
جن کی تہیں آپس میں جذب اور بے جذبہ ہیں

صبح ہوئی ہے

صبح ہوئی ہے جیسے لمبی سیٹی کی آواز کے ساتھ
گاڑی اسٹیشن پر جھٹکے سے رُکتی ہے
میرے ہاتھ بندھے ہیں میرے پَیر بندھے ہیں
آنکھیں جیسے مدہم ہوتی دیا سلائی
بے خبری میں خود کو آگ لگا بیٹھی ہیں

زندہ ہیں کہ اپنے دُکھ کو گِن سکتے ہیں
حاضر ہیں کہ ساجھے داری کے ثمرات
کو دیکھ کے چُپ ہیں
گزری رات خداؤں کے آسیب کا حاصل
ان کی ٹیڑھی میڑی شکلوں میں رستہ بھولے ہیں

دل بھرے ہوئے ہیں نغموں کی افسردہ دلی سے
ہر موسم میں ان کی کھوج کے آگے

دل کے زخم کو کاڑھ کے ان کو سیتے رہنے میں
مشغول رہے ہیں
صبح ہوئی ہے جیسے آیت نازل ہو
رحم و کرم کے سایے سایے بارش بن کر برسی ہو
دنیا لٹا کر کروٹ کر لیٹے تھے
تکیے کے اس سانپ کو پھینک کے اٹھ بیٹھے ہیں

دل ڈرتا ہے حوض کا پانی خندق میں گرتا ہے
گزری شب کی تلخی الجھن اور بلاوا
کچی نیند میں ایک ابال رہا ہے
گھڑی کی سوئی نے پردے چاک کیے ہیں

اُسی پرانی روزانہ کی جھک جھک میں دل لگتا ہے
وہی پرانے لفظ کبھی لَو دے اٹھتے ہیں
کبھی بجھارت بن کر کھو جاتے ہیں
گو کھالیں کھینچنے والے چھریاں تیز کیے بیٹھے ہیں

وہی پرانی فرمائش ہے وہی تقاضے
جاں کو ہدیہ کرنے کے سَو رستوں میں سے
ایک ہی رستہ کھلا ہوا ہے
یہ ترغیب نہیں یہ قاتل کی فیاضی ہے

ہاتھ ہری دوبیں جو وقت سے پہلے سبز ہوئیں
دن کی نوخیزی کے حُسن کے پاگل پن کو جذب کیے
چلنے اڑنے بہنے والی چیزوں سے وہ لپٹ گئی ہیں
اک سودائے خام کہ جس کا سحر نہیں ڈھلتا ہے
شہر کو نیند بہالے جائے یا کم خوابی
یا پھر پانی کی قِلّت کی پیاس
یہ کوتاہی کی جڑ جس پر اُگے ہوئے
ایک ہی خواب کی چھت کے نیچے
سنپچو بن کر بیٹھے ہیں

صبح ہوئی ہے اس کو دن بھی کہتے ہیں
دن جو دھوپ ہے گرمی ہے کاہش ہے
تیر جو واپس نہ آئے گا
اٹھنے سے پہلے بھی منہ کی کڑواہٹ سے
رِسنے والا لعاب..........

قاصد ہے، ہرکارہ ہے یا ڈھول کو پیٹنے والا
یا فیصلہ کرنے والے کسی نتیجے پر پہنچے ہیں
یہ دن لکڑی کا گولا ہے جس کو دانت پکڑ کر
رستہ چلنے والوں سے ٹکراتے ہیں
باہر سے سالم ہیں اور اندر سے ٹوٹتے جاتے ہیں

ابوغریب کے بھُوت

سلاخیں تالے اور دروازے
دیواروں میں کھبنے والی میخیں
کھوپڑیوں میں آنکھوں کے آئنے
خستہ اور شکستہ

جسم اکہرے دُہرے گوشت کے ڈھیر
زندہ حرکت، زیرِ تشنج
لفظوں کو مَس کرنے والے ہونٹ
ان کو چھو کر کڑوے
منہ سیّال لعاب
زباں کی لرزش اپنے مٹنے کی تسکین سے باغی

گوری عورت، فوجی جوتے، ہاتھ میں ہنٹر
وحشت ناک ہنسی جو بالوں میں مستی کی صورت

پھرتی ہے، اور اک شور کے ساتھ
اپنا سراپا کھول رہی ہے

نہ دن ہفتے کی چھنگلی ہے، نہ شب گنتی کے اندر
سیہ سمندر، تیل کا لاوا، روشن آگ
جینا مرنا دونوں کھوٹے سکے
نیند تڑپ ہے جسم کے روئیں روئیں سے
جس کو باہر کھینچ نکالا ہے

روشنیوں کی باڑ پپوٹوں کی جونس نس
چھان چلی ہے، ذہن کے اندر پھوڑا
جس کو دھونا چاہیں، دھو نہ سکیں
چیخیں کچی رگ ریاں، کبھی دانتوں سے
سالم نکلیں اور کبھی ٹکڑوں میں

گورکنوں کی فرصت میں موسیقی......
اپنے اندر چھپنے کی یہ راہ بھی اب مسدود ہوئی ہے
اک چنگھاڑ فلک کو چیر سکے تو چیر سکے
بجلی کی رَو، بولی براز رطوبت
اور عقوبت کے اوزار میں بوٹی بوٹی
جوڑ اور بند کسے جاتے ہیں

ماضی حال اور مستقبل سب اندھے کھلاڑی کے
پانسے ہیں، ایک جہنم اس کے پہرے دار
قطار میں چلتے ہیں
دھواں اور آگ مقدر کی برساتی ہیں
خنجر اور تلوار کی اب کیا حاجت ہے

دل سوکھے ہیں، نہریں بھی سوکھی ہیں
آنسو پیپ بنے ہیں
بدن مسافت کی ترغیب سے ہلکا ہے
مٹی تھا اب آگ سے بوسہ چنتا ہے

نہ ہابیل تھے نہ قابیل
پھر بھی موت نے ڈھونڈھ نکالا ہے
جنم جنم کی پیاسی آنکھیں عذر اور عرضی لے کر
اپنے حرفوں کے عرفان میں دفن ہوئی ہیں

موت فسانہ اور حقیقت گھلے ملے
یادداشت کی یہ کمزوری ہے یا بخل
ماتھے پر جو بشریت کا داغ ہے
اس کو خوں سے دھوئیں پھر بھی
جلد پہ دھبا رہ جائے گا

نہ پتھر بولے جن پر خون گرا
نہ چیخیں پھول بنیں نہ چلمن جن کی آڑ
میں رہنے والے پیڑ حوالہ اور رسالہ
ہوا بے دردی سے اوراق اُلٹتی جاتی ہے

نہ رستے پھانسی کی تکلیف کو کم کر سکتے تھے
نہ دستک جو دیوار پھاند کے مرہم بنتی
خود ہی اُبلے خود ہی لاوا بن کر
اپنے آپ پر برس گئے

خاموشی اور غیریت کی تنہائی میں
امداد کے پشتیبان وسیلے ڈوب چکے ہیں

کوئی دن ہو برس ہو

کوئی دن ہو برس ہو پہر ہو
بھاری ہو بوجھل ہو تو اتر سے وہ رستہ روک لے
اور سانپ کی صورت لپٹ جائے
تو اس کی دوستی کے زہر کو انگیز کرتے ہیں

کوئی ٹکڑا خیال و خواب کا جو راہ چلتے بے دھیانی میں
کہیں پر سوجھتا ہو، نیند کے اور جاگنے کے بے کراں
لمحوں میں اپنی آرزو تعمیر کرتا ہو

کوئی شب ہو درختوں کی طرح کے سائے جس میں کھو گئے ہوں
آسماں بارش کے قطروں میں پنہ لے
جنتری کے اسم اپنی معنویت کے لیے
کمزور دل کی انگلیوں کو چھیلتے ہوں

بدن کے زخم تارے ہیں کبھی یہ پیڑ کے پھل کی طرح
اُمید کے گودے سے بوجھل اور بھاری تھے
خزاں کی روشنی میں خشک پھولوں کی طرح ہلکے

کوئی دن ہو برس ہو پہر ہو
ارزاں گزر جائے تو اس کی خامشی کو
بوتلوں میں پیالیوں میں بانٹتے ہیں
اس کی دھیمی آگ کے مشروب کو
رُک رُک کے پیتے ہیں

یہ جان امانت ہے

یہ جان امانت ہے اسے میں وقت سے پہلے
بانٹ نہیں سکتا
خنجر ہو تلوار ہو یا پھر جیبی چاقو
ان کی رفاقت حوصلہ دینے کو کافی ہے
خود سے باتیں کرنے کا وہ وقت اور موسم
گزر چکا ہے
اسموں میں سے اسمِ نکرہ اور حرفوں سے
توصیف کا وصف علیحدہ کر کے
دنیا کے چہرے کے اترے غازے کو تکتا ہوں
میرا دوش ہزیمت کو الفت
اور قید کے سُونے پن کو تنہائی کا نام دیا
ناقص تھے اور کچے پھل کی صورت آندھی سے
نہ کیڑا لگنے سے محفوظ رہے
انار کی صورت خود کو کھولا، گورکنوں کی صورت

خواہش کے تہ خانے میں پوشیدہ
اک اک اینٹ پہ ضرب لگائی
ہر اس بت کو توڑا جو بخشیش پہ قائم تھا
نیند کو درہم برہم کرنے والی پیاس نہیں تھی
تیز بخار کی حدّت تھی
دن سپنے جو طاق اور جُفت کے خانوں میں بیٹھے ہیں
آنکھیں پھوڑ چکے ہیں

اتنے دنوں کے بعد

اتنے دنوں کے بعد مجھے یوں لگتا ہے
ماضی کے رومانی یا روحانی پیکر
جس خواہش سے روشن تھے
وہ بجھنے لگے ہیں
خوابوں میں چلاّنے والا بچہ
اب کروٹ لے کر سوتا ہے

تحریروں کی ناپختہ عبارت
ان کی زدو گوئی کی چربی
نومشقی کا زور بہاؤ
اس کی مقناطیسی گرمی
تن کو ڈھانپ سکی نہ جاں کو

کمروں کی دم گھونٹنے والی خاموشی میں
چت لیٹے ہیں
دن کے واویلے کی جھاگ
لبوں پر سوکھ چکی ہے

زندہ مردہ چیزوں سے سمجھوتا کر کے
بیزاری کے اسباب نہیں
افعال کی تہ تک پہنچے ہیں
چیزوں کے پہچانے جانے چہروں پر
غیریت ہے انکار نہیں
بس قربت کا اظہار نہیں

سینہ کو تھامنے والی بے بس ہاتھوں کی دیواریں
جن کو آخر گرنا تھا
اور یہ میری ضد جو چوس رہی بیدار پروں کی تاب
فلک کے ہیکل کی پُر جوش صدا

میں گنبد جس میں آوازوں کا شور
بالآخر بے معنی تکرار میں بے الفاظ
خود اپنے گونگے پن کی قید سے باہر
جانے کی کوشش میں زخمی

پانی کی چادر ہو یا مٹی کی چادر، پیڑوں کی پرچھائیں ہو
یا شیشے میں بہتے عکس کی راحت
مردہ دل میں مردہ دلی کو راسخ کرنے والی حُجت
سب اندیشے ہی اندیشے تھے

پیروں میں لکڑی کی سختی، چلتا ٹھوکر کھاتا
خود سے کہتا موت سے دوری دو فرلانگ سے
اوپر ہے، ابھی کچھ رستہ باقی ہے

یہ خستہ کمرے اور دالان، اکیلے پیڑ کی
مجذوبیت، گلیوں میں سناٹا یعنی ایسا شور
جو طبع کو رفتہ رفتہ چاٹے

بس خلوت میں یہ کھلنے والی شہوت
بدن کو سونپے جانے کا بپتسمہ
قرض کی صورت قربت کا میلان

رُخصت ہونے والی گیند کی صورت ٹپا کھا کر لڑھکے
پھر اُبھرے نہیں
ان کے نہ ہونے سے احساس ہوا
اس دوزخ میں تنہا نہیں تھے
نہ ہی آگ کی شرطوں کے پیماں کے آگے گونگے

اک مرتی دنیا اپنے پاس بلاتی ہے
اپنے جسم کی آلائش سے میرا چہرہ دھوتی ہے
میں جو املتاس کے آئنے میں پھیل چکا ہوں
اور متواتر وحشت کی بے صبری سے
خزاں کی ویراں سیر کے لمبے رستے پر ہوں

جان کے باقی ماندہ صفحوں کو گننے کی
تعزیر نے مجھ کو خانوں میں محدود کیا ہے
آنکھیں اب کجلائی نہیں ہیں نہ ہی وہ چندھیائی ہوئی ہیں
چرمی قلمی نسخوں کی اِملا میں
ہر شے صاف نظر آتی ہے

میرے پاس دکھاوے کے الفاظ نہیں نہ لہجہ ہے
بے جا عذر کی ڈور تھمانے والوں نے
دنیا کے کابوس کا استعجاب سمیٹا
پھر اس کو پیروں سے روندا ہے

جاں کے کونے کھدروں میں وہ چشمِ تماشا
اب مسحور نہیں محصور ہوئی ہے

اتنے دنوں کے بعد مجھے یوں لگتا ہے
مجھ میں دفن حوادث میں اک تازہ برقی رو
سرایت کر آئی ہے
زائد ساز و ساماں کو انگار دکھا کر
ابجد کے ایندھن کی راکھ اُڑاتی ہے

اتنے دنوں کے بعد مجھے یوں لگتا ہے
نیند کو ضربوں سے میں کھود رہا ہوں
نیند جو مٹی بھی ہے بیج بھی ہے تاریکی بھی
اور سونے کی خواہش بھی

زاہد مسعودؔ کی نظم ''تیز بارشیں'' کی تضمین

وہ ایک نیم روشن دن تھا
جب میں نے تمھیں دیکھا
اور میں ہسپتال کے طویل کوریڈور میں تیزی سے ایمرجنسی وارڈ کی طرف جارہا تھا، میری ماں جس کی عمر اسّی سے تجاوز کرچکی تھی، دمے کے زوردار دورے سے نڈھال، آکسیجن ماسک پہنے مجھے اپنے سامنے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی، ٹنکچر کی بُو اور خون کے چھینٹے، زندگی اور موت کے درمیان ایک غیر فطری اشتراک سب کچھ بھولتا جارہا تھا۔ انگریز نرسیں خوابوں سے لتھڑی ہوئی عورتوں کے درمیان تم کیفے ٹیریا کی میز پر کافی کے ساتھ کرواساں پر جھکی ہوئی
زندہ رہنے کے لیے حوصلہ ہارنے والی باتیں بار بار پیچھا کرتی ہوئی
میں نے تمھیں دیکھا ہماری ملتی ہوئی نظروں کے درمیان
پھیلے بیگانگی کے سراب میں بھٹکتے ہوئے
ناآشنائی سے شکست کھاکر
پچاس سے تجاوز کرکے، آنکھوں کے مردہ چاند، بے سود ستاروں کی ٹھنڈک، شیشے کے پار ہوا، پیڑوں کو چھوکر گزرتی ہوئی عمر کے دنوں کی طرح جس کا کوئی

اور نہ چھور، یادیں پت جھڑ کے مرجھائے ہوئے پتے جن سے خود بھی دل گرفتہ،
دلیے کے بیچ گھاس میں بکھرے ہوئے، رینگنے والے کیڑوں کی رطوبت، آسمان
کی چھت سو بار گرے یا بارش کے جھکڑ بہالے جائیں، ان آنکھوں کی جلتی
جوت اپنی جگہ اٹل ہے۔ میں ماں کا ہاتھ پکڑ کر اس کو حوصلہ دیتا ہوں، برسوں کی
تلخی کو اس لمحے بانٹنا چاہتا ہوں، اس پر جھک جاتا ہوں اس کی ڈھیلی نبضیں،
پھر بھی پختہ ہمت کے آثار، ڈھیلی نبضیں، تیری آنکھوں کی بیگانگی دونوں سراب،
دل دریا خود ہی ڈوبنے والا ہے۔ کوئی پکار کوئی پتوار کوئی سہار کوئی مہار

ہوا موتیے کی خوشبو اور بیتا ہوا وقت اٹھا کر کیسے
دالانوں اور پرانی راہ داریوں سے گزرتی ہے
کالے بادل، تیز بارشیں اور پرانے گیتوں کی بازگشت

بیتا ہوا وقت چٹکی کی طرح سیہ دھبا بنتا جاتا ہے، جیسے اندر سے کسی نے کاٹ لیا
ہو، ابھی کل کی بات ہے گورکی کا ناول ماں پڑھتا تھا جہاں وہ گھر گھر جا کر
پرچہ تقسیم کرتی ہے۔ سب کے دُکھ سُکھ میں شریک، جگت ماں، تم بھی جب تک
میں باغی نہ ہوا تھا اور تمھارے سپنوں کی چادر سے پاؤں باہر نہ نکالے تھے سب
کچھ برداشت کرتی تھیں، گھر دیر سے لوٹ کے آنا، تکیے سے ٹیک لگا کر گانے
سنتے رہنا، ایک پودا جس نے ہر صورت تناور پیڑ بننا تھا جس میں کوتاہی کی کوئی
گنجائش نہیں تھی، بارشیں تھیں جب میں چھپ چھپ کر برہنہ ہو جاتا تھا، اپنے
جسم کو مَلتا رہتا جیسے کوئی چشمہ بند ہو اس نے کھلنا ہے۔ گلیوں کی کھنگی، مشکل
رزق، بہنوں کا ہجوم میں بھی ان میں لڑکی ہی تھا

میری خود کلامی کی آنچ اور اندر گرتے آنسوؤں کی نمی
پیرہن سے باہر ہونے والی گفتگو

بے چین کرتی ہے

دائرے ہی دائرے کیا تمھیں معلوم ہے غالب کے شعروں کی تشریح پڑھتے پڑھتے ایک ایسی دنیا مجھ پر حاوی ہوگئی جس سے ہم سات نسلوں سے انجان تھے، وہ کیا تھا جس نے غیریت کا بیج بویا مجھے گرہستی سے چھین لیا، آنکھیں وقت اور حافظے سے چھین لیں۔ دنیا کی شاہراہوں پر کٹی ہوئی پتنگ کی طرح بے ڈول، کیا ہوگا اس سے بے خوف، کیا کرنا ہے اس سے بے پروا، خود سے باتیں کر کے تشفی کی کوئی صورت، دوستوں کی صحبت میں بخت نے ساتھ نہ دیا، بالآخر کتابوں نے ہلدی جیسے مرہم کا لیپ لگایا، ہلدی جس سے میری رنگت بدل گئی، ایک کایا کلپ جس کے معنی اور مفہوم سے ناآشنا کیا وہ عنکبوت کی ڈور تھی جس سے بندھا تھا یا بے دست و پائی میں کوئی اور راستہ نہ سوجھا تھا، کچھ کرنے کی دُھن، لیکن کیا، خود کو رہا کرنے کی کوشش یا خود سے رہا ہونے کی خواہش، ایک دلدل میں دھنستا چلا گیا آج تو اس موت کے بستر پر دراز ہے اور اگر کوئی بُت میرے اندر تھا، وہ ٹوٹ گیا ہے

سوئی ہوئی رات میں
روشن دن کے خواب کی مانند
کتابوں کے لفظ ہمکنے لگیں گے

میری صحبت باخبر لوگوں سے تھی پر میری بے خبری کی حس کچھ جذب کرنہ پائی، آج میں تیرے سامنے اس شکستہ عمارت کی طرح جس کے مکیں نقل مکانی کر گئے ہوں، تم اس حقیقت سے خوب آگاہ ہو کہ تم ہی میرا آخری سہارا ہو، تم پر موت کی سختی کی ابتدا ہے پھر بھی تمھاری آنکھوں میں میرے لیے دور دور تک بے بصری کی خاک اڑتی نظر آتی ہے۔ ایک جہاں تاریخ ہونے والا ہے ایک

جہاں تم خود تاریک کرنے والی ہو، ایسا ہی میرا جرم تھا اتنی ہی میری غفلت اور بھلاوا تھا کتنا زنگ تھا، جو تمھارے خاموش آنسوؤں سے، تمھارے اندر گرتا رہا اور اس کی تہ اتنی موٹی ہوگئی کہ میری پہچان بھی اس میں زائل ہوگئی۔ جیسے میں بھی اپنی پہچان کی حدود سے باہر نکل آیا ہوں، سکرات کے عالم میں تمھارے سامنے اک مجذوب کی طرح ہوں ساتھ والے بستر سے کلوروفل کی بُو سے گھبرا کرتم میرا ہاتھ تھامتی ہو کتنے برسوں کے بعد آج ایک لمحے کے لیے تم سے جڑ گیا ہوں، میری آنکھوں میں روشنی کی جڑیں کھلنے لگی ہیں اپنے ٹوٹے ہوئے دانتوں پر سختی سے ہونٹ بند کرکے میں اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنے سارے امکانات پر حاوی ہونے کے بعد اس زرد مرجھائے ہوئے چہرے پر ایک زندہ جاگتی مسکراہٹ لانے کی کوشش کررہا ہوں کہ تم جان سکوتم میرے لیے اٹوٹ تھیں میں وہ بچہ تھا جو بھیڑ میں کھو گیا تھا۔ ایک ہلکی مسکراہٹ چہرے پر ابھری ہے اور مجھے یقین ہے اب تم مجھے چھوڑ کرنہیں جاؤ گی، روشن دن کی تاب کھلنے لگی ہے اور کیفے ٹیریا میں بیٹھی ہوئی لڑکی کافی کے کپ پر جھکی ہے، اس کے خدوخال کی موہوم پرچھائیں جاگنے لگی ہے ہاں تم جی جاؤ گی ہاں میں بھی جینے لگا ہوں۔

پُتلی گھروں میں

بستی والے پُتلی گھروں سے
نوحے اور فریاد کی چھڑیاں لے کر نکلے ہیں
اور سڑکوں کو پیٹ رہے ہیں

پُتلی گھروں میں آنسوان کے خستہ رسائل
ان کی بہکی بہکی عبارت
درد سے لذت قید میں راحت

پُتلی گھروں میں خواہش جیسے مہلک بیماری ہو
جھوٹے سچے قصّوں کِھلواڑ غذا کی صورت
جزوِ جاں ہو

پُتلی گھروں میں تاریکی کا گہرا کیچڑ
جسم فروشی کی ذہنیت
بھاؤ داؤ کی کیفیت

پُتلی گھروں میں آس ہے لمبی دوڑ
اک بے رونق موسم کی دلدل کا حزن
خود سے لپٹے خوف کا خبطی پن

جو رشتوں کو جذبوں کو اور تنہائی کو
ہندسوں اور اعداد میں لکھتا جاتا ہے
دن کی قاش اُٹھا کر منہ میں رکھتا اور اگلتا ہے

سرمستی یا خودسوزی کی رسموں کا اجرا ہے
کاغذ پر آنسو کی شکل جو دھبّا ہے
چہروں پر جو ضائع تبسم کے چھینٹے ہیں

عمریں گلیاں پیڑ ہوا اور پت جھڑ
اک چیخ ہے جس کے تن کا ملبہ
خواہش کی دلدل پر گرتا رہتا ہے

پُتلی گھروں میں سورج ہے نہ چاند کے بیٹھے کا انداز
ایسی درد کی دستاویز
جس کو پڑھ کر ہنستے ہیں نہ روتے ہیں

آنسو ہیں نہ الجھن ہے بس ایک سوال
یہ گھر قحبہ خانہ جس کے اندر باہر
سب دلاّل

سیب میں جیسے کیڑا

سیب میں جیسے کیڑا ایسے تمنا
دل کو نشتر بن کے چیر گئی
ایک دہائی فرصت کی تھی
اس پر بے فکری کی چھت تھی
چیزوں کو اور کاغذ کو اور جسموں کو
جی بھر کر چھونے کی لذت تھی

شجر حجر اور جملہ موجودات کے بیچ
نشے میں بھیگا گردش کرتا
عورت کا زرخیز بدن
جس کی رغبت قطرہ قطرہ چاٹ رہی تھی

جب آواز کی گُٹھلی کھولی
اس کے بیج اُلٹ کر دامن میں بکھرے تھے
میں سمجھا مجھے امانت سونپی گئی ہے

ایک دہائی ان بیجوں کی عصمت کی رکھوالی کی
ایسے جیسے نابینا قرآن کے کوفی حرفوں کو چھوتا ہے

اندازے سے پھر سطر سطر پڑھتا ہے
اس کی رحمت کو برکت کہتا ہے برکت کو بینائی

یوں ہی میں نے جسم کے گرمی دانوں کو تدبیر کہا
ان بیجوں کو تقدیر
زباں کی لکنت کو تعزیر کہا

جب کچھ لکھنے بیٹھے تو اک دنیا گھور رہی تھی
لکھنا کیا تھا کاغذ پر وہ آڑی ترچھی سطریں
خود کو قائل کرنے والی سرگوشی
لکھتے تھے حیران تھے اپنی لِکھتوں پر
اک اندھے پن کا سحر تھا اس کی تاریکی

ذہن معطل تھا اور آنکھیں دیکھ رہی تھیں
اپنی ہی خود ساختہ دنیا کی تعمیر
اس کا ہی پھیلاؤ اور تشہیر
غوطہ خور کا دھیرج لے کر اترے
اور پرزہ پرزہ چھان لیا

لوگوں کا انبوہ تھا یا پھر کرداروں کی بوقلمونی
بے ترتیبی میں ترتیب ذہانت کے حیلے سے
مجھ سے باہر وہ دنیا تھی جس کے اک پلڑے میں
میں تھا، اک پلڑے میں دو سو سال کی بود و باش
کے بھاری پتھر

سزا جزا قانون کی حد تک ٹھیک ہیں
لیکن روحوں میں جو نغمہ تھا اس کو کتابی شکل میں
آنے تک میری نہیں نسائی بدن کی حاجت تھی

ایسا لوبھی اپنا کچا گوشت چبا کر خوش تھا
ایسا خودسر
سب کو چھوڑ کے گورکنوں میں آن ملا تھا

دبی کراہوں، بندی خانوں، چیخ پکار سے گھبرا کر
کردہ اور ناکردہ سے محجوب
ہاتھ میں معافی کی درخواست لیے
ان بیزار خداؤں کی مجلس سے اُٹھ آیا ہوں

ارزاں تھے معصوم تھے خود کو مالِ مفت سمجھ کر
بانٹ رہے تھے اس پنڈال میں جس میں

کھیل کے اختتام سے پہلے یکسر لاتعلق لوگ
اُٹھے ہیں

اک دنیا مجھ سے پہلے لیکن میرے ساتھ
اپنے رازوں کا بٹوارا کرتی
گری پڑی اور ضائع چیزوں میں
اس گم دنیا کی متلاشی ہے
جو رفتہ رفتہ غارت ہوتی جاتی ہے

وہ خواہش تھی یا فتنہ

وہ خواہش تھی یا فتنہ یا آسیب
جو معمول کی باتوں
چائے اور خوردونوش کے ساتھ
پروان چڑھا
یہ سچ ہے گہری سوچ کی فرصت تھی اور رخصت بھی
اور جو بھی رشتوں میں لکنت تھی آڑے آئی بھی
ساتھی بھی گم کردہ منزل تھے اور ہم بھی
یعنی سوچ بچار کی حد تک تو بھٹکے ہی تھے
جھوم رہے تھے یعنی گھوم رہے تھے
دنیا موتی چور کی رنگت
میٹھی دیدہ زیب
ہلکی ہلکی شہوت جس کی رونق تھی
اک انجانے کیف کی مخبر
رات نہیں افسانہ گو کی طول بیانی کا جادو تھا

گلیوں کی خاموشی میں اسرار کہ جیسے
غیب سے القا ہوئی عبارت
بے خبری اور بے بصری بھی نعمت تھی
بوسہ یا دشنام کسی بھی قصے کی تمہید نہیں تھا
خود میں وہ فلزاتی قوت اس کا تیقین
خود کو سمجھانے کی حد تک یہ احساس
یہ بکھرے ہوئے تجریدی شکلوں کے کابوس
حرفوں سے مس ہو کے زندہ ہو سکتے ہیں
دنیا کی تصویر کے پیچھے یہ تصویر
زیبائش کی تحریک تھی، کیا سمجھے کیا نہ سمجھے
بہتے پانی کی تمثال رواں اور مست......
گلیوں میں گلیاں تھیں جیسے چھپے خزانے
غافل نہ تھے غفلت پردہ پوشی کا حربہ تھی
جان گئے تھے ہر دم بولی کی زد میں ہیں
یوں جسموں اور روحوں کے پارکھ، نگراں
تول رہے تھے سستا، مہنگا

بد مستی یا بدبختی تھی
اپنے کند اوزار سرہانے رکھ کر سوتے
اور سمجھتے جس سپنے کے پالن ہار ہیں
اس کی حسن وخوبی اس کا اور اور چھور

نہایت خطرے میں ہے
آنکھوں سے تیزابی جھلی گری تو یہ معلوم ہوا
خیر اور شر سے بالا اک سفا کی
میرے خون میں ہے
جینا ایک سخاوت اور رعایت ہے
یہ فتنہ اور آسیب بھی ہے

دل کی مسند جس پر سدھائے ہوئے کھلاڑی
آمنے سامنے بیٹھے ہیں
گو آب و ناں کی رخصت سب گروی ہے
پھر بھی شرطیں بد کر کھیل رہے ہیں
شہر اکھڑتے خیموں کا ملبہ ہے
پیاسے پیر جو طبل و دف کی مدہم ہوتی لے کا
پیچھا کرتے کرتے تھک سے گئے ہیں
ہاں شہر کنارہ ٹوٹی بوتل ہے
جس میں اپنا لہو پسینہ
اور انزال جمع کرتے ہیں
سچ پوچھو تو
نیند سے بہتر تکیہ ہے نہ پشت
اُمید سے بہتر کوئی پستان نہیں

جو لکھا ہے اسے مٹانے میں

جو لکھا اُسے مٹانے میں دل کی شکست ہے
جو سوچا وہ لفظوں کی غارت گری تھی
جو ہمارے دلوں سے اڑ گیا وہ رعب تھا

جس سے بات کرو اس کی کہانی لمبی ہوتی جاتی ہے
وسط سے شروع ہو کر وسط کے گرد ہی گھومتی ہے
کندھے سفر کے تھیلوں سے جھکے ہوئے ہیں
جیسے ایک جہنم سے دوسرے جہنم کی طرف جا رہے ہوں

ہر حرکت کرنے والی چیز کششِ ثقل کی پابند ہے
نیند چھری نہیں دارو ہے، پیاس بوسہ نہیں پودا ہے
عمر کا غلاف پھٹ بھی سکتا ہے

گھروں سے نکلے نہیں دھکیلا گیا ہے
ہجرت اور جلاوطنی کی دھتکار سے پاؤں
اُکھڑ چکے ہیں، دن تابوت ہیں، بھاری، وزنی، پھولے
اپنے لیے کندھے ڈھونڈھ رہے ہیں

میں لکھتا ہوں اس اُمید پر کہ فردا دیوار نہیں دریا ہے
صبح غسل دے کر نہال کر دیتی ہے
خبریں وہ اتری ہوئی جوتیاں ہیں
جن کے منہ مشرق اور مغرب کی طرف مڑ گئے ہیں

زمانہ فہم سے ماورا عدالت نہیں
صرف اس کی چابی کھو گئی ہے
سورج کی کتاب کھلنے تک پرندے جاگ نہیں جائیں گے
خواب ہمارا رزق ہیں اور بچے تجوری نہیں

گردن توڑ بخار کے بارہ برس گزر گئے ہیں
پانی میں منادی والے کی آواز ڈوب گئی ہے
دنیا برہنہ ہو کے اپنی کشش کھو چکی ہے

مارو یا مر جاؤ اس مقولے کی آڑ میں
دکان میں اپنے مال کو سجایا ہے

نہ چاہتے ہوئے بھی بیسوا کی طرح سج کر بیٹھے ہیں
مرے پاس نہ اب زچگی کے قصے ہیں نہ ہی ان کا
مرہونِ منت ہوں، جن کو تھاما وہ رسّیاں نہیں تھیں
نہ ہی وہ ڈور تھی، بالائی کی طرح چکنی سی چیز
آنکھوں کے سونے پن کی جگہ اک دشوار اُجالا تھی

اس کو دفن کر دوں تحریر فتنے کی طرح چابک گھماتی رہی ہے
اور سوائے اس کے کہ حشرات الارض جلدی جلدی
قدم اٹھاتے اپنی پناہوں کی جانب دوڑے ہیں
اور درخت کھلکھلا کر ہنسے اور آگ کے لیے دامن کھول دیا ہے

مویشی اناج منہ میں لے کر جگالی کر رہے ہیں
میرے اطراف موت سہولت کی طرح ہے
ہم آغوشی سے نہ گرمی حاصل ہوتی ہے نہ وصال
اپنے کپڑے جھاڑ کر اُٹھ بیٹھا ہوں

بجلی چلی گئی
نیکی اور بدی کے فرشتے ٹھٹھرنے لگے
ان کے کلام کی حفاظت نہ ہو سکی
دنیا بلوے کی پیداوار ہے اور اسی کی جانب بڑھ رہی ہے

سال کی آخری نظم

گلھاڑے سے شاخوں کے کٹنے کی آواز
آبی ذخیرے پہ گرتے ہوئے پھول
مرتے ہوئے دن کی پھیکی خنک
ماند پڑتی ہوئی روشنی
میری کھڑکی سے باہر وہ دنیا
جو مجھ سے علیحدہ نہیں

اتنی چاہت سے اپنی ضیافت کو بیٹھا ہوں
مشروب کو اور کھانے کے سامان کو
اک سلیقے سے رکھا ہے، ہاں آج کے دن
میں خود انجمن ہوں، وہ چہرے وہ بہروپ
سب آسرا دینے والے، مرے ہم نشیں
سب یہیں ہیں

مرے نصف بہتر جو خلوت میں جلوت میں
ہمزاد تھے، وہ دلوں کی گھٹن
اور بدن کی اداسی کے وارث
مرے مثل و ثانی

وہ پیکر تھے میرے تراشے ہوئے، مجھ سے قد میں بڑے
مجھ سے بے خوف تھے، ان کی یہ تمکنت
اور تکریم اک بوجھ تھا جو اٹھاتا رہا
پھر ضرورت سے زائد سمجھ کر
انہیں اپنے چہرے سے نوچا

یونہی ہر دہائی میں صورت بدل کر
میں اپنی تواضع کو تفہیم کا رُخ سمجھتا رہا
اتنے ابعاد میں منقسم اپنے چہروں کے بیرونی
اور باطنی زاویوں میں
کسی مشترک قدر کو ڈھونڈنے میں
زمانہ لگا

آگ کا کھیل تھا برق و باراں کا منظر نہیں تھا
کسی ایک چہرے کو جو ضرب لگتی
وہ بچھڑے ہوئے ہوش پر وار بنتی
کہ ان کی ہلاکت تھی میری ہلاکت

مرے جام میں تند صہبا نہیں زہر ہے
اس کو پینے کے بعد
اس گئے سال کے رجز میں جم کے بیٹھا ہوں
جب تک کہ گرتا نہیں ہوں

دیے جو دریچے پہ ہیں اور دیوار پر
میری سانسوں کی ٹھوکر سے بجھنے لگے ہیں

اندھیارے کی مٹی

اندھیارے کی مٹی جس کے آگے سر بہ سجدہ
پیڑ سے کھائے پھل کی صورت جھکا ہوا ہوں

ناموجود حوالوں کی پُرسش کا لمحہ
یعنی اپنے حلیے کی تکرار کے آئنے میں

اپنے بُت کی آپ پرستش
اپنے مونولاگ کی خود سے پھر تجدید

جو ہونا ہے جو ہوگا اس کا رکھ رکھاؤ
اس میں پھانسی دینے والے کی ترجیحی عُجلت

یہ مقتل ہے، قاتل اور مقتول برابر
میں شام کی صف میں کھڑا ہوا ہوں

اس اُجرت کی تمثیل کا محور ہوں
جہاں پر جسموں اور روحوں کے دعوے دار

ہاتھ میں سونٹی لاٹھی یا تلوار لیے
اقرار یا انکار کے لفظوں کی نسبت سے

قربت یا فرقت کا سودا کرتے ہیں
کاغذ پر میں اوس کا قطرہ ہوں

یہ قطرہ نہ آنسو ہے
نہ جلنے والی قوت

خالی نظریں اپنے برہنہ پن کی خفگی سے ٹکرائی ہیں
دل میں آتش کے بجھنے سے جو تھوڑا بہت اجالا تھا

وہ اب سمٹ رہا ہے
اور علم ابال نہیں ابکائی تھا

جس نے مجھ سے پیاس بھی چھینی الفت اور جوانی بھی
اور مشقت، استغراق

گو آنکھیں بند نہیں ہیں، نہ ہی
سپنوں کی نزدیکی سے گھبرائی ہوئی ہیں

اک بے انجام اداسی کی غرقابی، جیسے کوئی صراحی
جسے پرائے ہاتھ لٹا کر مَیل کو دھونے والے ہوں

جاگ رہا ہوں کڑوے پتوں کے چرنے کی صورت
ان کے کڑوے پن سے خوں میں بینائی کا ضعف

اور ہجرت کی سنگلاخ زمینوں کے منظر
جو بارش کی آواز سے دُھل کر صاف ہوئے ہیں

جن کو اوڑھ کے پھرتے تھے وہ جسم کے رشتے
بستر کے متلاشی تھے

راتوں کا بحران وہ چوبِ خشک کی دیمک
کھڑکی کو دروازوں کو اور مجھ کو چاٹ رہا ہے

خود میں روپوشی کے سُکھ سے جاگ گیا ہوں
موسم اور مخلوق کے ناموجود توازن کا شکوہ

جو زیرِ لب تھا اور تالو کو چاٹ رہا تھا
سیٹی کی آواز میں اس کو چھیل رہا ہوں

ہاں جس جھاڑی پہ برق گری اور جل کر خاک ہوئی
وہ کچے ارمانوں کی شاخ نہیں تھی

دنیا کے اور عقبیٰ کے
تحلیل ہوئے اندیشے تھے

میرے اندر رات پنپ رہی تھی اور جہنم
اور نہ ہارنے والی خواہش کی منہ زور کشش

اور جوانی کی تبخیر

وہ موت نہیں تھی نیند کی گولی کی راحت تھی
اس کی مرہم جیسی مدہوشی تھی

پیڑ سے کچے پھل کی صورت لٹکا ہوں
کہ اس سے ٹوٹنے والا ہوں

جینا اچھا لگا

جینا اچھا لگا
چیزوں کی ٹھنڈک میں تن آسانی تھی
بستر سے اٹھنا تھا جیسے برف کا گھلنا

اور جسموں کا یہ اجلا پن نہ سورج سے نہ دودھ سے
اور نہ نیت سے ہے
نہ ہی وصل کی خواہش سے نہ پیاس سے ہے

یہی ادھورا پن اب سرما کی یخ بستہ ہوا میں شامل ہے
ایک ایسی دوری جس کو کوستے رہنے سے
دن بیت رہے ہیں

عشق سِوا یا نصف نہیں تھا جو چنتا تھا
راہوں کی بے نام اداسی، اُس سے زیادہ لالچ تھی
جو جذبوں کی شدت کو قائم رکھنے کی کوشش تھی

بوسہ تھا کوئی قصہ نہیں تھا
نہ دیوار پہ اشتہار
جس کی عبارت پڑھ کر ہنستے

تم اک جسم تھیں جیسے میں تھا
یہ کھلیان نہیں تھا
نہ تربوز کی قاش

اب ان گِنے چُنے الفاظ سے کیسے ظاہر ہو
کہ اپنے برہنہ پن کی ڈھال کے آگے
کھرا ہی کھرا تھا

جو باتیں کیں نہ بیج تھے نہ بارش کے قطرے
نہ ان کا کوئی ضامن ہے
نہ ان کا کوئی شجرۂ نسب

دل ٹوٹے لیکن موسم کے پانی نے
جِلدی میل کو دھویا، آخری غُسل سمجھ کر
غم کو نچوڑا

جینا اچھا لگا
کہ بجلی سے بچنے کی خاطر دونوں کھلاڑی
آمنے سامنے آئے

باتیں شور ہیں، نیند نہیں ہیں
باتیں جاں لے سکتی تھیں
پر لے نہ سکیں

جینا اچھا لگا
کہ پھولوں کے موسم میں
پھانسی دینے والے رخصت پر تھے

بہت خوشتر نہیں

بہت خوشتر نہیں بے خواب ہونا
لبوں سے اوس کو دھونا
جو آنکھیں دیکھتی ہیں بیت جاتا ہے بدن پر
بدن اس ذائقے کو تھامتا ہے
ادھورے لفظ اس کو نام دینے کے لیے
اپنا سراپا چھان لیتے ہیں

جو گزرا ہے مشیت کا وہ لمحہ تھا
کسی نظارگی سے معتبر نہ منقطع
اس کا لحن خوں میں دباؤ ڈالتا ہے
عدد اور حرف سے منہا سوانح کی طرح
جو حاشیہ ہے، ضابطے کی کاروائی سے الگ

لہو میں آنچ ہے اس کو خوشی یا دُکھ کہوں
تصور کی طرح پامال ہے پھر بھی قریب
نظر خود اپنی بینائی میں ایسے ڈوبتی ہے
جیسے آنسو میں نمک

سفر فریاد تھا ناراضگی کی ابتدا سے
اور پیالہ بن کے دونوں ہاتھ کھلتے تھامنے کو
منصفی ہو یا خسارے کی تجارت
یا رفیقوں کے لہو کا خوں بہا ہو

میں تم سے ہوں کہ تم اک شخص ہو
حالت یا سمجھوتا نہیں ہو
نہ اَنا کی پرورش کا آئنہ ہو
تمھارا زندہ ہونا اک حقیقت ہے
کوئی قصہ یا افسانہ نہیں ہے

دنوں کو جوڑنا سیکھا انہیں پابند کر کے
کہ یہ آبی ذخیرہ ہے وداعِ شام کے
سایوں کے نیچے، کسی چھتری کے کھلنے تک
گرفتِ شب ہے یا پھر عافیت ہے

جو پرندوں کی پہنچ سے دور ہے یا یہ رسائی ہے
جھلک بے اختیاری کی، ہماری معذرت کے گرد
جو گھیرا بنا کر لوٹنے کے واسطے ماضی کی چادر کھول دیتی ہے

مگر ماضی کی جانب لوٹنا
کاپی میں رکھے خشک پھولوں کی طرح اک رسم ہے
اجرا ہے یا تجدید ہے خاکوں کا رنگوں کا
اٹل امید کا، اور شخصیت کی بکھری پرتوں کے بہم ہونے
انہیں معمول کی حد تک ہمیشہ کی طرح
اُلجھائے رکھنے کا، یہ وہ پستان ہے
جو چوسنے سے الجھنوں کو دُور رکھتا ہے
دنوں کو جوڑتا ہے ہر طرح پابند کر کے

یہ ہاتھ

(i)

یہ ہاتھ جو نہ آسمان کو اٹھا سکتے ہیں نہ خود کو کریدتے ہیں، نہ اپنے لیے
کوئی گڑھا کھود سکتے ہیں

ایک کانٹوں والی باڑ جسے نہ میں دل کہہ سکتا ہوں نہ آنکھیں
شام رپورتاژ کی طرح پھیلی ہوئی اور وسیع ہے

یہاں صرف دنیا ڈھانے والوں کے گواہ بن کر بیٹھے ہیں
میرے آگے لقمۂ تر ہے پر دل اُچاٹ ہو چکا ہے

یہ ہاتھ پھولوں کی شاخوں کی طرح نازک قلم کی طرح پتلے
شور و شغب اور گہما گہمی سے بھرپور

ہاں کبھی زمیں بستر تھی اور جھولا اور حقِ زوجیت کی طرح
قابو اور دسترس میں

دن طلوع ہوتا تھا جیسے بوسہ، موت خوشگوار مختصر کہانی کی طرح
المیہ اور طربیہ صرف الفاظ تھے دل ابھارنے کے لیے

خواہش ظلم سہنے کا نام نہیں تھی اور پیار پستان سہلانے کا نام
اور وقت، گھڑی کی ٹِک ٹِک کی طرح بیچ میں انگارہ نہیں تھا

بچھڑ جاتے تو فریاد کرتے اور اس میں سوز بھی ہوتا
اب اک دوسرے سے جونکوں کی طرح لپٹے ہیں

حلال اور حلول کی شریعت کے تابع
اک دوسرے کو چکھ چکھ کے زائل کر دیا ہے

دستر ہرن کے کھیل میں شامل ہوں، اب اپنی برہنگی سے
کوئی پردا یا مصافحے کی اُمید نہیں

یہ ہاتھ جڑی بوٹیوں کی پسائی ہوئی مرہم، درد و دروغ و دغا کے لیے
یکساں مفید اور شفا بخش

یہ ہاتھ

(ii)

یہ ہاتھ پرانے گھروں کی دیواروں سے ٹکرا کر سمٹتے ہیں
جیسے کچھ اندر رکھ رک بھول گئے ہوں

ریڈیو کی سوئی الف لیلائے کے قِصّوں کے جذبات کو چھوتی ہوئی
ان کے کردار کے تنگ جاموں میں پنہ لیتی ہوئی

اصوات، نباتات میں بند بیج کی طرح، ایسی قوتِ لایموت
جس کو کوئی رکاوٹ نہیں

کوئی بھی موسم ہو تنگ ظرفوں اور کمینوں سے رستگاری نہیں
دل برداشتگی کوئی بیز نہیں

قحبہ اس آرزو کا نام جسے دفنا سکتے ہیں نہ بیاں......
خواہش کے متوازی خواہش

ہماری ملاقات کی ضیافت ایسی تھی جیسے جنگجوؤں کی برات
جن کا سامان گدھوں اور خچروں پر لادا گیا ہو

دنیا چلنے پھرنے کے لیے کافی تھی ہاں دل لگانے کا موقع محل نہیں تھا
اور پھر اسلحہ بردار بھی پیش پیش اور چوکنّے تھے

نرم بول پہلے رومال کی طرح نُبک تھے اور گلے کی گھنٹی سے گرجے کی
گھنٹی کی آواز کے ساتھ بلند ہوتے

پھر ان کو اپنی ہی چاہت کی نمی نے ڈس لیا

اسی لیے خواہش کو دودِ پریشاں کہتے ہیں کہ یہ آس اور پیاس ہے
ایسا اندوہ جسے لفظ گرفت میں نہیں لے سکتے

اور جو گرفت میں لے سکتے ہیں وہ تنخواہوں پر پلنے والے ہمکاری ہیں
جو بے بنا واہی تباہی بکتے ہیں

یہ ہاتھ اکیسویں صدی کی چادر سے مردہ چوہوں کو جھاڑ کر پھینکیں گے
یہ ضرور گڑھا کھودیں گے اجتماعی قبر کے لیے

چار پرندے

عابد اصغر اور فیاض اور میں
چار پرندے
لفظوں کے کھلیان سے دانہ چُن کر
اُڑنے کی کوشش میں

اوپن ایئر کا ریستوران
گرمی کی دوپہروں کا وہ بہتا پسینہ
وہ پے در پے سگرٹ کے کش
تالو میں تمبا کو اور چائے کی تلخی

وہ میز کے چاروں اور سمٹ کر
سر کو جھکا کر
سوچ میں ڈوبے
نئے زمانے کے درویش

ادب میں خیر اور شر کے ناتے گھلے ملے ہیں
اس مضموں کو لے کر
تکفیر کی حد تک چھان رہے
جملہ صحائف کے اقوال
پھر تفسیر کے نکتہ وار مراحل
ان کی حرمت اور تقدیس
ان کے حواری، ان کے داؤ پیچ

مچھلی کے قتلوں سے کانٹے علیحدہ کر کے
ان کو سگرٹ کے ٹکڑوں میں چبھوتے
خارش کرتے ہاتھ بدن میں گرمی دانے پھوڑ رہے تھے

ان سب میں ایسا شاطر پن تھا
اور غصیلی ہٹ دھرمی
اوپر کی معصوم ادا
اندر کی تاویل سے بوجھل

فہم تعقل اور وجدان کی آویزش سے
منطق کی تنسیخ سے
معنوں کی ابعاد کی کثرت
ان کی رمزوں اور اشاروں تک رسائی
ان دیکھے کی رونمائی

ان اقوال کی نشوونما میں
سسٹم کے طاقتور حربوں کی
پشت پناہی
اس اثنا میں اپنے اور لوگوں کے
ذہنی اور مادی افلاس کا ماتم کرتے

یوں بہکے بہکے پھرتے تھے
اپنی جوانی سے عاجز اور جنسی بے تابی کی شدّت
جسموں کو سنجوگ کی حالت
بھوگ کے آسن میں تکتے تھے
دو پہیوں پہ سارے شہر کی ورزش کر کے
بستر پر پھر آ گرتے تھے

جو لکھتے تھے لکھنے میں ٹھہراؤ نہ تھا نہ لکنت تھی
سر میں الجھا الجھا شور غوّاصی کو دعوت دیتا
چند لفظوں کی گیلی کمند
چند جذبوں کی ڈھیل

ذہن مجرّ ہے، ٹھہرے ہوئے پانی کا حوض
اس میں ڈوبیں
معنی کو بپتسمہ دیں

چاۓ رہائی کی سوغات بنی اور آنکھوں میں
منظر کی وسعت تھی اس کا پھیلاؤ
اک بند تھا جس نے آخر ٹوٹنا تھا
جس نے ماضی کی بوطیقا کو
کھڑکی سے باہر پھینک دیا
خود سے شرطیں بِد کر بیٹھے
اپنا یقیں ایمان کی حد تک پختہ کر کے
شعر نہیں مذہب تھا
رومان نہیں تھا جیون داؤ

اپنے تشخص سے انکار
اس کی نَو دریافت
اپنی کہانی کے مرکز میں خود سے اُلجھے
دنیا سے اور رشتوں سے بیزار
باغی نہیں جھنجھلائے ہوئے تھے

بے چینی تبخیر کی صورت گھیر رہی تھی
اپنے حال کی مستی تھی یا بے ہوشی
کوئی تھپکنے والا ہاتھ نہ تھا
اور طبیعت کی رنجوری
جلد بہلنے پر مائل نہ تھی

لیلاؤں کے نرغے میں خود لیلیٰ تھے
اپنے ذہنی پنکھ سنوارنے میں مشغول

عابدؔ نشتر کالج کے کیفے میں بیٹھا رہتا
سب سے غافل بے پروا
بولتا جاتا جو بھی سننا چاہے
زرعی استحصال کے قصے
چھوٹی قومیّت کے لیڈران کا اغوا
بندی خانوں میں دن رات چھپا کر
ان کو اذیت، بہنوں کا بچوں کا ریپ
سندھ کی باغی شعری روایت
ماں بولی کی حرمت اور تقدیس
اس کے علاوہ غیر زباں میں لکھنا
لعنت اور غدّاری
یہ وہ دن جب تازہ تازہ نیرودا کے
شعر کا چرچا، بریخت کی تمثیلوں کا ذکر
محفل میں اخباروں میں
تجزیوں میں مذکور رہا
یہ بات عزیز الحق کے وارد ہونے سے پہلے کی ہے
اس کے خفیہ سیاسی ساتھی یعنی فیوڈل لارڈز کے باغی بیٹے
اپنے بڑوں کی ہٹ دھرمی سے عاجز

اپنے لیے جو رہ نہ پاتے
تم اُن کے پیر و مرشد تھے
جو کچھ لکھتے اس کو چھپا کر رکھتے
لفظوں میں وہ طنز کا تیور
نظموں کے مقصود پہ حاوی
کتنے پُر امید تھے تم اس مستقبل سے، کل سے
اپنا ہدف پہچان چکے تھے
یہ ملتان تھا، دِلّی نہیں تھا

لُو سے پگھلی دو پہروں کے سارے مباحث
آخر آخر گھڑی حدیثوں کی تاویلوں کی
تحقیق میں کھوئے، تم عاشق نہ تھے
یعنی ناف سے نیچے کی چیزوں کا ذکر تو کرتے تھے
لیکن شغف نہ رکھتے تھے
زندہ دل اور سچے اور معصوم
ایسے لوگ ہی اپنی قبر کو کھودتے ہیں

اصغرؔ جس کو شعر کے شوق کا مارا ہم سمجھے تھے
جو لمبی لمبی بحثیں سنتا، پھر اخبار میں
چسکا لے کر ان کو لکھتا
پھر وہ کالم کاٹ کے لے لے پھرتا

کتنا خوش تھا، اتنا خوش
کہ جس کو اردو کی ٹیوشن دیتا تھا
اس سے اپنا دل لگا بیٹھا تھا
اپنے آپ میں رونق پا کر شعروں میں بھی
رونق کے اور قوت کے آثار دکھائی دیتے تھے
ہم اس کے شعر کے شارع اور مفسّر تھے
یہ دل بہلاوا تھا اور اُس کو مٹھی بھر نظموں کی
قید سے باہر جانا تھا
کھلے فلک میں، اپنی خواہش کے آکاش کی جانب
اور فیاضؔ جو اپنے اندر خاموشی کے قفل کو
توڑنے کی کوشش میں
ابجد کے حرفوں کے سونے پن کو تکتا
منگیتر کو تقریریں لکھ کر دیتا
اس کی نظریں اور کسی ہدف پر تھیں
اپنے جال سے باہر کے اس جال میں اٹکا
کھویا کھویا کبھی یہ لگتا گھر جا کر روزانہ کی رُوداد کو
ذہن میں دہراتا ہے، کچھ باتوں پہ آمادہ ہے
اور کچھ باتوں کی تفہیم کو کل پر چھوڑ دیا ہے
سنجیدہ پرنئے پرانے کے مابین وہ کھنچتا رہتا
جس کو عابدؔ کی باتوں میں ننگی دہشت گردی
مینٹل ماسٹربیشن کے آثار دکھائی دیتے تھے

گوغورے سارے قصّے سنتا
چے گوویرا کے گوریلا حملے ہوں یا میرؔ کے
غم کا خود پر استبداد، تنہائی کا قہر
شعر کو لکھنے تک محدود نہ رکھا
ہر دن جیسے روشن بھی مٹیالا بھی
ہم سب اپنے دل میں چور لیے پھرتے تھے
اس شہر کے اُجڑے پن سے خائف
چھوٹی بحر کی صورت گلیاں خستہ اور ناصاف
اسی طرح تاریخ جو یکجا نہ تھی نہ از بر تھی
نہ اس میں کوئی فوریّت جو حاوی ہوتی
نہ کوئی مرکز نہ کوئی محور
دن تھے ڈھلتے جاتے تھے
کسے یقیں تھا ہم میں بھی کوئی ٹیلنٹ ہوگا
کسے یقیں تھا دنیا کا یہ کاروبار
یہ روپ سروپ، یہ بندھن یہ برتاؤ
سب آرائش ہے، کچی بنیادوں پر ہے
اک جھٹکے سے اس کے اندر چھپا تصادم
کھل کے باہر آجائے گا
ان لمحوں کی چرب زبانی
حکمت کے آثار دکھائی دینے لگی تھی
جو کمزور کو فربہ رکھتی ہے

کسے یقیں تھا ان گلیوں کی دھول میں چلتے چلتے
فرصت ہی فرصت کی شب باشی میں
خود پر پلٹ پڑوں گا
مجلس کے آداب سے غافل اپنے پھوہڑ پن سے
پھکڑ پن سے روندوں گا
اپنا گریباں پھاڑ کے میں تو نکلا ہی تھا
اپنے برہنہ پن کی بے شرمی کو، پاگل پن کو
تھام رہوں گا
اپنی پہیلی کے اجزا کو ڈھونڈنے نکلا تھا
اپنی نویلی گھات نشے میں رکھتی تھی
مدہوشی کے عالم میں بھڑ جاتے تھے
شیشے میں اس عکس کے
ہونٹوں کے باتونی پن سے
پینشن کی عمر میں آ کر بھی ان وقتوں کی آوارہ گردی
بے تدبیری، بے ترتیبی، وہی ملامت کو دعوت
اب بھی سر کھجلاتی ہے
اب بھی وہ گرماتے قصے میری نکیل کو تھام کے
اس کو کھینچتے رہتے ہیں

قطرہ قطرہ لمحوں کی......

قطرہ قطرہ لمحوں کی رفتار کے ساتھ
لمحوں کے پیروں کی گہری چاپ کے ساتھ
بنتے اور بگڑتے سائے
آنکھوں میں اب اوس کی صورت
تصویروں کے قالب بن کر تیر رہے ہیں
روشنی و تاریکی کا محلول

خود کو تھاما ایسے جیسے دنیا کو تھاما ہو
ایک ہزار سے زائد آنکھیں گرما کی نگراں ہیں

جو کہنا تھا کہہ سکتے تھے جن سے کہہ سکتے تھے
وہ خود بھی بھول بھلیّوں کے آخر میں ٹھٹکے سہمے
ہم سے زیادہ بے بس تھے

وہ غوغا تھا یا فاسد مادہ یا پھر ڈنک
جس کا حساب نہ میرے پاس ہے نہ ہی کسی کے پاس
جیسے چھری سے پانی کو کاٹا ہو

ایک غبار ہم خود تھے ایک غبار ان کاغذ کے پشتاروں سے
نکلا تھا، پڑھتے تھے نامشکور نہیں تھے

کس کا شکر کریں خواہش کا جو گلیوں گلیوں لے کے پھرتی
پھیلے خلا میں جس میں ہول نہیں تھا

جیسے دنیا کی بصری تصویر کا سرکارا ما گزر رہا ہو

جو کچھ بیتا جبر نہیں تھا، دنیا کے اس خاک وخوں کا ملبہ
خود ہی کھود رہے تھے، تعطیل کی حد تک گونگے تھے
تحقیر کی حد تک بہرے

پانی بھی آلودہ تھا اور سالن بھی، آنکھیں کپڑے دھونے والے
صابن کے تیزاب سے جلتیں

اپنی آگ کی گرمی کو تو ٹھنڈا کر سکتے تھے
موسم کی گرمی سے مخدوش ہوئے

اور بھی لوگ اور ہم سے بہتر اور بھی لوگ
تیز قدم سے چلنے والے، رستے کی پہچان کے پارکھ

ہجرت کر کے دنیا کے ہر کونے میں آباد ہوئے
ناول کے کردار کتاب سے باہر آ کر رستہ بھول گئے
اور ہم جو پاگل پن کو چوری کر کے سکتے میں ہیں
بوڑھے آقا کے خراٹوں جیسے محنت کے قصوں میں کھوئے

اب جن پر چونچیں تیز کیے جاتی ہیں
جن کو آگ کے پاس ڈرانے کو رکھا ہے
وہ مسروقہ مال کہ جس کی کوئی جنس نہیں ہے
وہ تشبیہ سے بالا ہے

تحریر ہمارا قالب تھی اور اس سے بڑھ کر
وہ تہذیب کا قالب تھی

یہ شرطوں کا کھیل نہیں تھا
اس میں پیادہ بننے کی مجبوری نہیں تھی

اپنے برہنہ زخموں کی تدوین تماشا ہو تو ہو
یہ تسکین نہیں تھی

اب شام کا دریا شب کے گہرے ساگر میں ملنے والا ہے
اس میں پاکی اور ناپاکی کی تفریق نہیں ہے

موت کی نزدیکی سے خائف ہر شے الٹ پلٹ کر رکھتا ہوں
نیند کی آمد سے پہلے کی بے خوابی کا ممنون ہوں
اس میں چھونے کی چکھنے کی راضی ہونے کی گنجائش ہے

غم اور ہنسی کی راکھ

غم اور ہنسی کی راکھ
دسمبر کا یہ کُہرا
صبح کے میلے برتن ہیں اور میں

تاروں کی نہ تھمنے والی آوازیں
تنہائی کی چونچیں
بیداری جو درد ہے نہ تسکیں

میز پہ عینک مفلر اور دستانے
وہ خواہش جو افسانے کی کڑیوں میں
رستہ بھول چکی ہے

باتیں وہ بادام ہیں جن کی گریاں
منہ میں پگھلیں، منہ تاریک حوالوں
کے کُہرے سے پھول گیا

جسموں کو وہ ڈھانے والی راز بھری خاموشی
اس کا جبر، چہرے جیسے غسل کیے پرندے
پَر جھٹکتے ہوں

مسحور رہے کہ دیکھنے والی آنکھوں کے آگے سے
پردے نوچنے والی قوّت سلب ہوئی ہے
یہ قسطوں میں جاگنے سونے کا خمیازہ ہے

صبح ہوئی تو اس کو بانٹ نہ پائے
وصل بھی دوری دھو نہ سکا
بوسے تھکانے والے تھے

تم اپریل کے اس جانب بچپن کے رُخ
جب اپنے برہنہ پن کی دید کی لذت
دسترخوان کے ہر لقمے سے بڑھ کر ہے

میں بھی ان سخنوں کی کھوج میں سرگرداں تھا
جو بستر کو شاداب کریں، اور ذہن
میں پلتی جونک کو فربہ ہونے سے روکیں

جُون دنوں کی چاکری تھی
بدن کو روندنے والے خوابوں کے قزاق
جواب دلاّل بنے ہیں

جو ٹوٹ گئے پیماں نہیں وہ بندھن تھے
وہ شجرۂ نسب کے رشتے تھے
تاریخ کے دھاگوں سے کھل کر جو بکھر گئے

بے کار میں خون جلانے کی عادت کا سہم
غم اور ہنسی کی راکھ سمان
ان زخموں کے مِلنے اور کُھرچنے تک ہے

روزی وچ کہتا ہے

بدیسی شاعری کے مجموعے کی نظم میں
شاعر یہ لکھتا ہے کہ مصرع ڈھونڈتا ہے
اپنے ہی ہم شکل مصرعے کو، ادھوری بات جو تکمیل کی
خواہش میں اپنے آپ کو پھر کھینچتی، پھیلاتی رہتی ہے
جو اپنی جنس کے اور پھر مخالف جنس کے الفاظ کو چمکارتی
ان کو مروت اور رغبت سے بُلاتی
لفظ لفظوں کو تکے جاتے ہیں گہرے غور سے
اور کھینچ لیتے ہیں بغل گیری کی خاطر زور سے
جو اجنبیت ناشناسی کے پسینے سے بھرے
نامحرمی کے ذوق سے مملو کھڑے ہیں
اپنے معنوں کے شگوفوں سے لدے ہیں
کوئی فقرہ جو ان کو کھینچتا ہے اور لفظوں کے قریں
کیا بات تھی جو کہتے کہتے رک گئے
کیا بات تھی جو خود وسیلہ بن گئی

اک دوسری ہی بات کا، کیسا اشارہ اور کنایہ
کھیل کے یہ داؤ ہیں کرتب ہیں سارے
معجزے کے ساتھ جب میری اَنا یا مَیں پگھل کر
بہ گئی تحریر میں، تحریر جو میرا حوالہ بن گئی
پہچان جس نے قید کر کے سی دیا منہ، طوق جو
بندِ گرامر کی جڑی کڑیوں سے ٹکراتے ہیں، ہلکی ضرب
جو آواز پیدا کر رہی ہے، میرے قابو سے نکلنے والی بات
میرے درپے ہے، وہ زخم ہے جو کہ مداوا چاہتا ہے
وہ مداوا جو مزید الفاظ کے مرہم کا جویا
کون ہوں میں کس لیے ہوں یہ بھی سب الفاظ ہیں
الفاظ کی ترکیب سے خود کو ٹٹولیں، اپنے بخیوں کو
ادھیڑیں، یا کسی نغمے کے پیکر کے پسِ پردہ چھپیں
روپوش ہو جائیں، یہی الفاظ چھینٹوں کی طرح اڑتے ہیں
ان کی جھاگ میں لپٹی اداسی جسم و جاں کو گھیرتی ہے
موج اندر موج گریے میں پنپتی، سوز میں سوزش میں
راحت دینے والی، یہ جہاں تخلیق کرتی ہے
جہاں نابود بھی اور بے وفا عورت کی صورت اپنے جسمانی
تلذذ کی گذشتہ یاد سے تڑپاتی رہتی ہے
کہ یہ جو بات جتنی ہے ادھوری ہے کہ یہ اک سَیل ہے
اور گفتگو تو جام بھر الفاظ ہیں اور خُم کے خُم ہیں

منتظر، جو سب شنیدہ نا شنیدہ نا چشیدہ رس لیے ہیں
ذائقہ جو ابتلا کا ہے کہ جس کی ڈوریاں کستی ہی
رہتی ہیں، خزاں خود رفتگی کا جال پر کمزور ہے
کبوتر کی طرح دیدے پھراتے دن ، ہماری بندگی
الفاظ میں جکڑی ہوئی اور خامشی
الفاظ میں موجود وسعت اور خلا، کہ جس کا کوئی
مرکز ہے نہ محور ہے، زمیں و آسماں چوگان کی بازی
کے میداں ہیں، وہ ذہنی کھیل جو سنجیدگی سے کھیلا جاتا ہے
میں پتھر کا وہ ٹکڑا ہوں، زمیں کا پہلا باسی
روشنی سے جگمگاتا، وقت کی غارتگری سے مانداب رستے
کی ٹھوکر میں پڑا ہوں، میں کہ نومولود ہوں
الفاظ ہی میں ڈھونڈتا ہوں ولدیت، اور اپنے بشرے کی
لکیروں میں وراثت ، کون ہوں میں آئنے سے
پوچھتا ہوں، آئنہ تاریخ کی بے دخل صنعت ، میرے ہی
الفاظ کو پلٹا رہا ہے، ان کی وحشت ان کی گرمی
مجھ کو ہی چندھیا رہی ہے، لفظ جو بارش کے کیڑوں کی طرح
ٹکرا کے کچھ پل رینگتے ہیں اور فنا کی گود میں
خلیوں کی صورت لوٹتے ہیں، جسم کو گر جسم کی حاجت نہ ہوتی
رات کے ازلی سکوں ہم بستری کے خواب سے لتھڑے نہ ہوتے
میں لپکتا تیری جانب اور تری آنکھوں کی نفرت سے پتا ملتا

مجھے میں حرف ہوں، تنہا ہوں، میرا ذائقہ اس گوشت کے
بوسے میں پنہاں ہے مگر یہ ابتدا ہے اور میں مخلوط ہوں
پانی ہوا اور ریت سے جو گرد بن کر اڑ رہی ہے
دیکھتی آنکھیں سبھی سہتی ہیں بے لفظ و دلیل و راز
جیسے میں حیا کے کورے کاغذ پر جھکا ہوں، گھورتا ہوں
ڈھونڈتا ہوں لفظ جو کہ مدعا ہے منتہا ہے اور جس کے
سوجھنے میں بھی مشیت ہے، کوئی قانون جس کے حد کے اندر
اندر گھومنا ہے، بات جب بڑھنے لگے تو بات کی بوسیدگی
کو بات کی مقراض سے ہی کاٹنا ہے،
اور وہ اک بے سہارا خامشی جو کیل کانٹوں کی طرح
چپکی ہوئی ہے آگ کے ہاتھوں سے جس کو کاتنا جاروب کرنا ہے
وہ میرا بیستوں چہرہ، طنابیں کھل کے بکھری ہیں، نہ سر پہ
چھت ہے نہ ہی پیر کے نیچے زمیں جس کی عملداری میں زندہ ہوں
زیاں بھی لفظ ہے، گہرا گیان اور دھیمے سُر
اک کھلبلی بن کر لہو میں چاک بن کر گھومتے ہیں، ثابت و سالم
ہوں لیکن لفظ مجھ کو گھڑتے جاتے ہیں، میں اپنے ہوش
اور پتوار، اپنا ساز و ساماں رکھ چکا ہوں ایسی کشتی میں
کہ جب طوفان آئے گا تو یہ اس کے تموّج سے بہے گی
لفظ مجھ کو گھورتے ہیں زخم بنتے ہیں جُھلاتے ہیں
مری کایا میں ان بیجوں کی نرمی جڑ پکڑتی ہے

مگر تنسیخ اور تاویل، اکہرے پن کی چادر کو ہلاتے ہیں انھیں
جھنجوڑتے، میں کانپتی لَو اوس کا قطرہ
زمیں کی جلد پر اک بدنما دھبا، مرا ہونا فقط لفظوں کے
پانسوں کا بدلتا پھیر، جو ترکیب سے ترتیب سے خالی
زمیں ہو یا سمندر ہو مجھے تو ڈوبنا ہے، اور مری تاریخ لفظوں
کا نہ تھمنے والا ریلا ہے، کبھی ابلاغ سے مملو
کبھی ابہام کی ٹوٹی گرہ، اور اس کے بیچ اک طرفہ تماشے کی طرح
میری وضع، میں وسط میں معنوں کا منبع، مجھ سے ہی
منسوب ہے تفریق یا تصدیق اس فردِ عمل کی جو جواز و اسم سے مربوط ہے
آزار کے اور خودکشی کے درمیاں اک شور ہوں،
پھر بھی نامسعود حالت میں بکھرنے سے گریزاں، ایک گٹھڑی کی طرح
سمٹا ہوا ہوں، چاولوں کے بیچ نغموں کی طرح سے کھولتا ہوں
پیش و پس منظر مرے اجداد کے وارث ہیں ان کے ساتھ میں
لپٹا ہوا ہوں اور ہر لمحہ کسی انہونی کا ہوں منتظر
حاضر و موجود میں لفظوں کو میں پیش آمدہ اس جنگ کی
خاطر مسلسل حالتِ تیاری میں چوکس نفی سے اور استہزا سے
ان کو دُور رکھتا ہوں، نہ میں خود امن میں ہوں نہ ہی یہ دنیا
گلی میں بھونکتے کتوں کی راسیں تھامنے والے جراحی کے
نئے آلات لے کر میری جانب بڑھ رہے ہیں، ہے کوئی الفاظ
کی مدحت سے ان کی ضرب کو سہلا سکے

اک خواب تھا بے لفظ و گریہ، آس، جس نے
چند روزہ زندگی میں معجزے کی اس نمو کے آسرے میں عمر کو
اس پیڑ کی جودت میں دیکھا جو زمین و آسماں کو ڈھانپتی ہے
پتا پتا اپنے قدموں میں خزاں کے سرد ہاتھوں سے بکھرتی ہے
یہ پتے جو خزاں کے ہاتھ سے ٹوٹے پرانے لفظ کے دارو
جنھیں پی کر میں اپنے راستوں میں اک مریضانہ ہنسی کے ساتھ
چلتا ہوں، دوئی میں منقسم اپنے جہنم سے نکلنے کے لیے
تحریر سے اور جسم سے نالاں، مخنث کی طرح بے آرزو
اپنی زباں کو چار لفظوں کے کٹہرے میں مقیّد کر کے
طوطے کی طرح دہراتا رہتا ہوں............

اے راتوں کی رات

(i)

اے راتوں کی رات، سنور
اے جسموں کے باغ، ٹھہر
دنیا روندی گھاس ہے
جس پر تو لہراتا ہے

تجھ کو اوڑھ کے کیا کچھ کھویا
راہوں کی مشاطہ بندی
آنکھوں کی وہ گھور جڑیں
پیاس جو دن کی ڈال کو دیکھ کے لگتی

وقت نہیں تھا، صبر کے کھلتے صفحے
سیاہی چھوڑ رہے تھے
ہنسنے کے اور رونے کے وہ سبھی بہانے

ذرا ذرا سی باتوں کی آگاہی
ذہن تھکانے والی

اے راتوں کی رات، سحر
گھنٹی کی بارعب شباہت ہے
یا خنجر کی دھات
یا چینی دان میں اُبلا دودھ
یا تمثیل جو بہرے پن کی مجبوری
سے زائل ہو

میں دنیا کا کذب نہیں تھا، نہ ہی
اس کے سچ کی ٹوہ میں رہنے والا
جسم جو پودا تھا اور پک کر جواں ہوا
رینگنے والے کیڑوں کی اس لیس سے لتھڑا
بیل کی صورت خود سے اور اوروں سے چمٹا

دنوں کو ہار کے سودائی تھے
پانی میں سندیس کی صورت دوری تھی
سورج کے اور سپنوں کے پیوند لیے
گٹھڑی باندھ چکے تھے

قصّے کے اس وسط میں آ کر بھول گیا ہوں
پہلی چوٹ کہ جس سے اُکھڑا اُکھڑا تھا
یا غم کی بپتیسی جس میں راحت ڈھونڈ رہا تھا
گو دنیا چرانے والی باتوں کی تکرار میں اب بیزاری ہے

اے راتوں کی رات، مگر
میں نے ہی اقرار کیا
اپنی کوتاہی سے میں نے
ہجرت کے مضموں سے اُنس
دلداری کو زینت دی
اک سوگند سے باندھ دیا

اے راتوں کی رات، مگر
ہم قہوہ خانوں سے یا قحبہ خانوں سے
مستی میں یا رقص کے عالم میں نکلے
نہ زادِ رہ نہ خورد ونوش
ایک چھڑی
غرّانے والے کتوں سے دوری کی خاطر
خود کو ضرب لگا کر ہوش میں رکھنے کی تدبیر

گونجنے والی ہر صدا سے لاتعلق
اور مسیحاؤں کی پھیلی چرب زبانی سے محجوب
اک روحانی استغراق کی مدہوشی میں
بیلچہ لے کر ان کو دفنانے کی خاطر
گہری کھائی کھود رہا ہوں

اے راتوں کی رات، ہنر
اک پسپا جذبے کا بکھراؤ نہیں تھا
نہ ہی مرہم، بیزاری پہ لیپ کیا

سال

سال کے تین سو پینسٹھ دن ہیں
باون ہفتے
دن اور رات شتابی آتے اور جاتے ہیں
پھر بھی اک اک پہر ہے بھاری
گرمی کی اس گانٹھ کو بارش نے دھویا ہے
سردی کی سوگند نرالی
جذبے ہیں یا خدشے ہیں لاہور کے پیڑ
کٹ کر گرتے جاتے ہیں
فیضؔ کے مصرعے
رستے گلیاں
شیشوں سے بھی نازک ہیں
عمرِ طبیعی تک شاید پہنچیں
سینوں میں کہرام ہے اس کو مہلت دیں
اس میں جو شوریدہ سری ہے

اس کو نچوڑیں اور بکھیریں
شہر کو چل کر ناپ لیا
ایک تناظر جس کے ہم قیدی ہیں
اور قیدی کا ہنسنا بھی اور رونا بھی
اس کی سزا کا حصہ ہے
جیتے ہیں کہ مرنے کی توفیق نہیں
ایسا پیڑ جو وقفے وقفے سے پھل دیتا ہے
زندہ بھی اور مردہ بھی
اپنی سیٹی کی آواز کی تلخ کلامی سے
میں خوف زدہ ہوں
مجھ میں زہر انڈیلنے والے اپنے اور بیگانے
میری ہر حرکت کو گھور رہے ہیں
میرا دامن تنگ نہیں تھا نہ ہی رزق کی تنگی
آڑے آئی، لیکن نگراں آنکھوں میں محبوس
پل بھر بھی آزاد نہیں تھا
اتنی قید و بند سے میں بے شکل ہوا
مجھ میں وہ تسخیر کا جذبہ سرد ہوا
انا کو ٹھیس نہیں پہنچی تھی چکنا چور ہوئی تھی
کنگھی کے دندانوں جیسے جلے ہوئے رستے تھے
گھر تھے جیسے چھلکے پھینک دیے جاتے ہیں
اینٹوں کی دیوار کے اندر

میں محفوظ نہیں تھا، پھر بھی ایک بھروسا
اتنے سوالوں میں تقسیم عبارت
جس کو پڑھتا اور رد کرتا جاتا تھا
خوش تھا کہ خوشحالی کا مفہوم
اکیلے پن میں خود کو چھوتے رہنا تھا
باغِ دنیا، نقش کفِ پا
جیلانیؔ کی نظموں کا الحان
ابی نمر کا عشقِ جواں
کچھ لمحوں کا میلاد تھا
لیکن اس کی تو تقدیر تھی
اس کا سارا تشخص
جسم سے اٹھ کر اس سورنگ کے
پھول کی دید
جس سے ہجراں اور وصال کے معنوں کی
ترتیب، تعین
اس کی یاد خوشی ہے
اس کا ہونا اور نہ ہونا بے مطلب ہے
سال کے تین سو پینسٹھ دن
اور باون ہفتے
جس خوشبو سے رفعت پاتے ہیں
اس کا مرکز نامعلوم

میرے اندر مایوسی کی گانٹھ سے
رینگنے والے کیڑے برساتی ہیں
لیکن ان کے زیرِ اثر میں
اپنے ہوش کو بے دردی سے
چھیلنے والی خصلت کے ہاتھوں عاجز ہوں
جن سرچشموں میں مَیں ڈوبا
ان سے اُبھرنے کی کوشش میں
آدھے بدن کو ہار چکا ہوں
آدھی لغت کو دریا برد کیا ہے
ناچیز کی الفت مجھ کو ڈھانپ چکی ہے
غم وہ خط ہے جس پر میرا پتا تھا
جس نے آخر مجھ کو ڈھونڈ نکالا ہے

ملامت

ملامت لفظ ہے یہ میں جانتا تھا، اس کی چار دیواری کے اندر کرب اور شور ہے، جیسے بہت سارے پرندوں کو ذبح کرنے سے پہلے دانہ چگایا جا رہا ہو۔ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ ناخن والے ہاتھ ہیں، ان کو امن نہیں کہہ سکتے، اور جلوس میں نعرے لگانے والوں کے ساتھ روپیہ بانٹنے والے ہیں، محرّم اور ملامت کی مہم ایک ہے، دو ہاتھ بلند ہوتے ہیں اور دودھ کی دھاروں کی طرح گرتے ہیں اس دل پر جو زنگ لگی تلوار ہے

ملامت کہے سے ان کہے کی جانب بڑھتی ہے اور جسم کو چھوتی نہیں اس کو پار کر جاتی ہے خداؤں کی بے نیازی سے گوندھی ہوئی مٹی روحانیت کا گلا ہوا پھل ہے یہ آگ بے مصرف دعاؤں کی لکڑیوں میں جلتی رہی ہے، ذائقہ تام چینی کے برتنوں میں منہ بند ہے۔ دنیا کی ولادت کی خوشی کا کوئی گواہ نہیں، اور تاریکی اور روشنائی کی کوئی ضمانت نہیں، میں کون ہوں یہ پوچھ پوچھ کر دنوں کی بھاپ اڑتی رہی ہے۔

وہ جن سے میل نہیں ہوسکا وہ کچے پھل کے اندر یاد تھی جو نمو نہ ہونے کے باعث منہ کو کڑوا کر گئی جس کی جلد کے اوپر دھبے تھے اور وہ اونٹوں پر صحرا پار کر کے آئے تھے ان کے گلے کی گھنٹیوں سے خاموشی اور انکار نے دہلیز پر دم توڑ دیا۔ بوسہ جو اُمید کا محور تھا دہن کے پتلے کاغذ پر رینگنے والا کیڑا تھا، اس میں آسائش تھی اور پنہ کارجز، اور ایسی گرمی جو کوشش کی ناکامی کو متواتر اُکساتی ہے۔

جب حلاج کو سُولی پر لٹکا کر اس کے ناخن اکھیڑے گئے اور پتلی جلد کی کھال جو فرماں برداری سے بدن سے ڈھیلی ہو کر نتھر گئی اور نچڑ گئی، لفظوں کے یہ بھاری قُفل جو کھلتے ہیں تو اپنے معنوں کی تقدیر میں آویزش کے آثار سے اپنی ہی تصدیق اور تنسیخ کے پہلو چُننے میں کمزور نہیں کم ہمت ہیں، اے شوریدہ سری میں آب نہیں ہوں خاک اور خاکستر ہوں۔

خود کو الزام دیے جانے کی راحت اور رعایت سے ناکامی کو صفر کے درجے پر رکھتا ہوں اور اس کے بعد کچھ اور بھی صفر، جوانی اتنی جلدی اتنی کثرت سے ہفتوں اور سالوں کی گنتی سے یوں غافل ہو گی سوچا نہیں تھا، اپنی بدلی شکل سے بے پروا اس مٹی کو کھودتی جائے گی جو عبدیت ہے، کمر کے گرد ہاتھوں کا ضدی پن وہ فیٹش ہے جسے نیا سال کہہ سکتا ہوں، محبت ایسا اناج جس کی جگالی ضروری ہو گئی ہے

پہلے جیل تھی اب مقتل ہے، گھروں سے ایسے اچک لیے جاتے ہیں جیسے کپاس

کے ڈوڈے فصل کے پکنے پر، ماتم کے لیے سواری بھی چاہیے عزادار بھی، جو زخم تھے انہیں فتنہ کہہ کر چھپا دیا گیا ہے، مجھے کاٹ دو یا باندھ دو مگر کتوں کی نگرانی میں مت رکھو، آدم کے جلوس کے پیچھے اُجرتی قاتل آپس میں گلے مل رہے ہیں، جانوروں کو مویشی نہیں کہنا چاہیے، کہ جن کا صحائف میں ذکر تھا، ان کا نزول ہوگیا ہے، میری پیٹھ ایک بینر ہے جس پر لکھا ہے میں بند گلی ہوں رستہ نہیں ہوں

ملامت یعنی اپنے بند کمرے کی دیواروں سے کمک طلب کرتا ہوں، سگرٹ کے مرغولے جو سولی بن کر ممکن اور ناممکن کو تعطیل کے دن تک پیچھا کرتے ہیں، دنیا کا سرمایہ اس کی شرم نہیں نہ ہی اس کا باکرہ پن، اس کی قیمت خطرے کی آگاہی سے سمجھوتہ اور اپنے بکاؤ ہونے کی تیاری کا راضی نامہ ہے، بستر ہو یا کھیت کسی کی عصمت اب محفوظ نہیں ہے، شعر کے باطن سے آمد کو کھرچ دیا ہے، غم کے صفحوں والی دسویں جلد تیار ہے، کھیل کا پردہ گرنے میں کچھ دیر تھی لیکن اہم کردار کے قتل کے بعد ہال میں اک سناٹا سا ہے، اس سے پہلے لوگ شور کریں دروازے بند کرو

ملامت حرفوں کی پنگل ہے، جب تک چاہو کاتتے رہنا ہے، یہ دنیا ہے یہاں جب جسم پر دستک ہوتی ہے اُسے بلاوا کہتے ہیں، یہ موت سے انٹرویو کی پہلی قسط ہے، آگے اللہ بیلی

میں اپنے قصباتی میووں

میں اپنے قصباتی میووں
جفتی کے اندوہ کے قصّوں
اور پرانی تحریروں کے خستہ کاغذ
گھر سے لے کر نکلا ہوں
کونجیں تھیں جو ان گلیوں سے چلی گئی ہیں
چہرے جو گھونگھٹ میں اپنی لاج سنبھالے
گھونگھٹ میں ہی دفن ہوئے
نیندیں جو دالان کے بستر اور ممٹی سے
بدن چرائے ، گرم ہوا کے جوتے پہن کر
باڑی کے اس پار گئی ہیں
سر پر چھتری بن کر کھل جاتی ہیں
کنویں میں گرتے آدھے ڈول
بچپن کے پیتل کے برتن
ہاتھ میں لپٹی کالی ڈور

چھوٹی انگلی چھیل رہی ہے
اک سپنا ہے جس کا بچپن ڈھل بھی جائے
اس کی پیاس نہیں بجھتی ہے
لفظوں کے بیجوں کے بندھن
ان کے ناموجود توازن
جن کی پرتیں کھول سکے
خود پر طاری ہونے کی کوشش میں
بھٹکے اور مجوب ہوئے
پچیس سال کی دوری سے
وہ سارے زندہ مردہ روپ
اب کھلونے لگتے ہیں
ایسے جیسے خالی ماچس کے ڈبوں کی
ترتیب ہے کوئی
کیوں کر مجھ کو ایسے لگا تھا
جلنے والی کوئی قوت
مجھے دھکیل رہی ہے
سپنے تھے یا انگارے
جو آگ انڈیل رہے تھے
زائد کپڑوں سے محروم
زائد لفظوں سے محروم

دنیا کی للچائی شبیہوں کے اوپر
دیوانہ وار چلے تھے
اور استر ڈھانپنے والے پتوں کو ہی
کھاتے جاتے تھے
کیوں کر مجھ کو ایسے لگا تھا
میں تشبیہ کی صورت
اپنا حوالہ آپ نہیں ہوں
دقیانوسی دنیا کی تزئین
یا اعصاب کو دھونے والی
ساری دعائیں بے مصرف ہیں
میرے آگے ڈھیر ہے ضائع لفظوں کا
اپنی نگراں تدبیروں کا
چلتا تھا اور خود کو تھام نہیں پاتا تھا
نہ پیڑ قلم تھے جن سے لکھتا
نہ پانی گھلی سیاہی
اک بچپن کی کوری کتاب
اس کے آگے چار جوانی کے صفحے
کچھ نام تھے جن کی ہمراہی میں
دنیا ڈھونڈنے نکلا تھا، پھر الٹے قدموں لوٹ گیا
ابھی تک ان کا کینہ میرے ساتھ ہے

اور تحقیر، جنہوں نے خلوت بخشی

خود کو یوں بے دام لٹایا

رستے کا سامان تھا رستے میں ہی اترا

کیوں کر مجھ کو ایسے لگا تھا

ایسے دکھ سے روشن ہوں جو نافرمانی

اور اطاعت سے بالا ہے

ڈوبنے والے ہاتھ جنم سے متلاشی تھے

رسّی کے یا چپو کے یا اپنے گلے کے

وسطی عمر کے آگے کے اہداف

وہ موی قندیلیں تھیں

جو اک اک کر کے بجھتی رہیں ہیں

سناّٹا ہے لفظوں کی تکرار

خراشیں بنتی جاتی ہیں

اب قائل کرنے اور سمجھنے سمجھانے کا وقفہ

محدود نہیں مسدود ہوا ہے

اے راتوں کی رات

(ii)

اے راتوں کی رات بتا
میری عمر تو جیسے تیسے بیت گئی
تیری بینائی کی قوت سمٹی ہے یا بکھر گئی ہے

ہاتھوں سے جالوں کی صورت لٹکی ہے
خوں کی شریانوں میں تیرے
مردہ مینڈک تیر رہے ہیں

تیری ہمراہی میں آخر بند گلی تک آ پہنچا ہوں
جو کچھ پاس تھا وہ بھی چھنتا جاتا ہے
چہرے کی تختی سے قوسیں گود میں گرتی جاتی ہیں

دنیا کی اس رسم ورہ کی دانائی سے بڑھ کر
اپنی دانائی کی زحمت سے مسحور رہے
دونوں ہاتھوں دیے کا شعلہ تھام رہے تھے

جو بھی حیلہ تھا وہ خواہش کے افسوں کا ہی اظہار بنا تھا
تن کو تھکانے والی لمبی دوڑ کے آخر میں افسردہ
ہر جیتی شے سے نوحہ بن کر لپٹ گئے

چپ تھے لیکن داؤ کی صورت
ضبط اور عجلت میں تقسیم، ذہن کی فاضل قوت
کوچہ گردی میں تحلیل ہوئی

اپنے گلے میں گھونٹ کی صورت اٹکا ہوں
اور خواب کی سرگوشی سے ڈر کر
جو کچھ بھولا اسے سمجھنے کی کوشش میں
خود کو عاجز کر ڈالا ہے

ساکت بازو جن پر کیڑے چڑھتے ہیں
چڑیاں جو آنکھوں پر چونچیں مار رہی ہیں
دور تلک نہ پانی ہے نہ دھان کے پودے

اے راتوں کی رات بتا
ہم سائل تھے یا پارکھ تھے، یا کھوجی یا تاریخ کی
مسخ روایت کے اہداف کا ایک وسیلہ تھے

یہ دشت نوردی، عمر کی یہ بیتال پچیسی
قصوں کی مضبوط کمند، جو رستوں کی
محدود کشش کو اور بڑھاتی جاتی ہے

ایسی گرانی، جو قربانی اور مقتل کی
اور پھانسی کی تثلیث کو
اک وحدت میں دیکھ رہی ہے

ایسے مسلک کی بنیاد
جس کی ثقافت کے رشتوں میں توازن
جبر سے ہی مشروط رہا ہے

باقی ماندہ جو میعاد ہے اس میں جینے کی توجیہ ہے
گویا کرتب کے اسرار ہیں
خطرے کی آگاہی کا اظہار ہوا ہے

جو کچھ بیتا سپنا نہیں تھا، زندہ رہنے
اور تکمیل کی خواہش کے انداز کے بکھرے جانے کی
روداد کا ہی حصہ تھا

گو خود کو بھروسا دینے والی خلوت
اس کا التفات میّسر تھا
یوں خود سے باتیں کرنے کے موقع کو طول دیا

پھر اس کو چرب زبانی سے پھیلا کر اور بڑھا کر
چشمک اور خود بینی کے مابین تنازعے کو
قائم رکھا، اس کی چربی کو ضربوں سے کاٹا

اس کے حظ کو قسطوں میں تقسیم کیا
آج تساہل تھا تو فردا نغمے کے بے معنی بولوں جیسا
پس از شور و شغب کچھ لفظوں کے چھلکوں میں پابند ہوا

دنیا کے بازار سے گزرے حاجت مند
اک موہوم تصور کی تشریح کے کھلتے آئنوں میں
سادہ سے ابلاغ پہ قانع

وہ نیند نہیں تھی ہمسائے کی بلّی کی
دو گھورنے والی آنکھیں تھیں
گاہ مذکر گاہ مونث

یعنی اس میں مرد و زن کے وہ آثار
ظاہر بھی اور چھپے ہوئے بھی
رسوائی کے شاہد

اے راتوں کی رات بتا
گلیوں کے بے کار تبسم کی پلکوں کے نیچے جو خوش خلقی تھی
وہ بھی داد کی طالب تھی

لہو ٹھٹھر کر اپنی ہیئت بدل چکا ہے
غیر انسانی رات تماشے کی دلدادہ بن کر
دنیا کو ایک پیشہ ور قحبہ کی صورت لوٹ رہی ہے

سانپ اور میں ہم دونوں ہی
دودھ کے اس پیالے پاس
اس کو وحشی نظروں سے تکتے ہیں

اے راتوں کی رات بتا
دن کی مہلت گھنٹوں میں یا منٹوں میں ہے
یا پھر عمر کی در بدری میں

یا پھر کھیل کی سیٹی کی دمدار صدا کے
سناٹے کے لحظے میں ہے
یا پھر وقت کے چھلکے کو الٹانے اور پلٹانے میں ہے

موت نو وارد نہیں

ولیم ہولڈن کی طرح جو فلم میں افریقہ کے کسی دور افتادہ جنگل میں پیدا ہوا اور اب بڑھاپے کے اور واپسی کے سفر میں لوٹ کر اسی آبائی گاؤں جا رہا ہے جہاں اس کے پرکھوں کی ہڈیاں ہیں اور کسی انسان کا نام و نشان نہیں ہے، یہ سفر شعوری طور پر موت کی آمد اور دفنائے جانے کا، نہ خوشی نہ غم، بس اس نظام کا حصہ جہاں موت بھی اک شے ہے اور نامسعود نہیں ہے اور زندگی بھی اک شے ہے جو حرکت حرارت اور سفر ہے لیکن اپنی بنیادوں سے بندھی ہوئی ہے، اسی کے تانے بانے ہیں اُسی کے تار و پود ہیں، اسی کے نظر نہ آنے والے دھاگے ہیں جو لپٹتے اور لپیٹتے ہیں، وہی لفظوں کی درسگاہ ہے، ذہن کو بنانے اور سنوارنے اور بکھرنے سے بچانے کے لیے کہ موت کی مشکل کو ایک ضروری شے قرار دے کر اس سے مفر نہیں بلکہ خود اس کے راستے میں چل کر اس کی آمد کا انتظار ہے، بے جوش و جذبہ اور اطمینان بغیر دِقّت کے یوں وہ پہاڑیاں چڑھتا جاتا ہے اور درختوں پر پرندے اس کو حیرت سے دیکھتے ہیں اور جنگل میں پوشیدہ شکاری آنکھیں اس کی رفتار اور سمت کو ناپ رہی ہیں، وہ صرف زمین پر لیٹ سکتا ہے آخری سانس کی آخری ڈوری کے ٹوٹنے تک اور اس کو

دفنانے والا کوئی نہیں، اس کو بے چارگی کی موت نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنے آبائی استھان پر راحت سے دراز ہے، اور مرض کو موقع دے رہا ہے کہ وہ اپنا کام انجام دے اور ہم جنہوں نے اپنے دلوں میں قبریں بنائی ہیں جن سے ہر انسانی خصوصیت اور پہناوا چھین اور اتار لیا گیا ہے ہم کہاں دفن ہوں گے موت کی مشکل اور بے چارگی اذیت نہیں بس اس سے صلح کا کوئی رستہ نہیں ہے نہ ہی یہ کوئی سخاوت ہے۔

دن بہ دن مضمحل اعضا مدد کو پکارتے ہیں لیکن رنجور دلوں کا کوئی طبیب نہیں، اس بستی کو چھوڑ کے جانے کا غم ہوسکتا تھا اگر مرہم جیسی کوئی چیز نباتات میں چھپی ہوتی، پتھر میری آنکھوں کی طرح ہیں اور چٹان میرے بدن کی طرح جو ہوسکتا ہے کبھی معدن میں تبدیل ہوں لیکن یہ میری خواہش نہیں اور وہ جو کہتے ہیں کہ ہم پھول بن کر ظاہر ہوں گے تو یہ خودرائی موت کے بعد بھی دلوں سے نہیں جاتی، فاصلے کیا ہیں اور سفر کیا ہے اور ہجر کوئی پُر معنی استعارہ ہے یا نہیں، صرف آگہی کے مختلف پہلو جن کو لفظوں نے آب و روغن دیا ہے اور آنکھ اس کے آگے دیکھنے کو تیار نہیں، موت کا نوحہ زندگی کے ہاتھ میں چھڑی کی طرح ہے جس سے خود کو ضرب لگاتے ہیں، تڑپنے اور تڑپانے کے اور بھی وسیلے ہیں جن سے ظلم کی شناخت ہوسکتی ہے، لیکن اس کو سہنے والے اس کے آگے ڈھال بننے کی بجائے اس میں جذب ہوگئے، ایک اتھاہ سمندر ہے جس کو پاٹنے کا ارادہ میں نے ترک کردیا ہے، زندگی اب پیلے کارڈ پر لکھے ہوئے نعروں کی دلکشی اور پذیرائی کی حد تک محدود ہے، جتنی بھی کوشش کرو سب خدا نہیں مرتے اور ان میں طاقتور نانِ جویں کی بوریوں کے اوپر بیٹھ کر آنکھیں جھپکاتے ہیں،

ان کی یہ فحش ادائیں دل چیر سکتی تھیں لیکن ہم پہلے ہی برہنہ تھے اور قطار اندر قطار اک دوسرے کی نیم خواندہ آنکھوں میں جھانکنے سے گریزاں، جلا دینے والی آگ کا نام رزق کی ناکامی رکھ دیا گیا اور کوڑے والے ہاتھوں نے پالنے کی طرح سنبھالا اور بے دلی کے اندھے کنویں میں پھینک دیا۔

اپنے آپ کو بدلے سے زندہ رکھا اور ترغیب سے لیکن اب وہ ساعت قریب ہے جس کا وعدہ تھا لیکن انتظار نہیں تھا، ہم سے گدھوں کی آنکھیں زیادہ ہوشیار اور تیز ہیں اور سونگھنے کی حِس، دبوچ جانے سے پہلے بہتر ہوگا کہ اپنے ماس کو خود ہی کھالیں کہ ہڈیاں چُور ہوسکتی ہیں لیکن فنا نہیں ہوتیں، یہ اب آخری ذوق وشوق اور مصروفیت ہے جس کے بعد ہمیشہ کا دن اور ہمیشہ کی رات صرف نام رہ جائیں گے، اب یادوں میں نہ کساؤ ہے نہ ملتجیانہ انداز، جن سے دو باتیں کرسکتے تھے وہ اپنے اوسان جمع کرنے میں لگے رہے، اور یہاں میں نے قبر کے لیے جگہ ڈھونڈنے کی سعی ترک کردی ہے کہ زمین ہم سے چھین لی گئی ہے، اور خود میں دفن ہونے کی کوشش میں اب امداد کی ضرورت نہیں۔

قصّوں سے آلودہ ہوش

قصّوں سے آلودہ اور پروردہ ہوش
بھٹک گیا ہے
اک ناتکمیل سفر کا درد اور اس کی خجالت
پیش رووں کی خاص عنایت

عرش و فرش کی تاریکی میں
ہر جا اپنے گم ہونے کی خبروں کی تصدیق سے
گھبرا اٹھے ہیں

رستوں کی گنجان پناہیں جال کی صورت پھیلی ہیں
ہجرت کی تحریری وراثت جو چمڑے پر
پتوں پر اور ہڈی پر مرقوم ہوئی ہے
اک اک تار علیحدہ کر کے بھٹک گئے ہیں

بے خوابی اور بے تابی کے لمحوں کا آزار
بے بس شیون کے اقرار کے ساتھ
تعطیل کے دن کے پودوں پر گرتا ہے

دن کی پھانکوں کی تصویر کے نقش لبھانے والے
خود بھی افسردہ تھے، سبزی اور مٹی کی
اس چھتری کے نیچے عجلت میں تھے

اور پھر ہمراہی کی خواہش وہ کانٹا تھا
جس کو تلووں میں یا پہلو میں یوں اگنے دیا
کہ کہیں کسی سے کسی طرح منسوب رہیں

خود سے مخاطب ہوں کہ دنیا سے انجان نہیں ہوں
دنیا کی اس رسم و رہ کی بے پروائی سے
میں تھکا نہیں ہوں

عُمر کے سِکّے دائیں بائیں پھینک دیے
اپنا جوہرِ قابل سان پہ رکھنے کے لمحوں سے خوف زدہ
اپنے سوال کے لایعنی مفروضوں میں
حظ ڈھونڈھ رہا ہوں

خود کو کھویا بچپن کی اس راز بھری انگشت کو چھیلا
اپنے ننگے جسم کی تنہائی کی تمجید سے خود پر
برہم ہو کر دشمن کی نظروں سے برسے

پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اتنی دور چلے
آگے رستہ ہے نہ منزل نہ اسباق جو ازبر تھے
نہ وہ خواہش جس نے اوڑھ لیا اور جکڑ لیا تھا

اک صحرا اور ایک جہنم کے آثار
مرنے کے آغاز کی تیاری کی رسمیں، جشن
زمیں کو لکھے نامے کے وہ خفیہ حرف
لوحوں سے اب خود کو ظاہر کرنے والے ہیں

تنگدستی یا مردہ دلی یا چاند کی نسبت کی
تشبیہ سے خود کو حیراں کرتا ہوں
باہر سے نادم ہوں اندر سے شرمندہ ہوں

ہر دن نعمت ہے

ہر دن نعمت ہے
اور اس کا ہی فیضان ہے
پر ہم سمجھ نہ پائے

سرقہ ہے یا جبر یا رغبت کا نقص
اک ڈھونے والے بوجھ کی سرداری
آنکھوں میں سکرات کی شکل

اپنے ظرف سے دست بدست مقابل
چیزوں سے پھر گا بھن پھولے پھرتے ہیں
نومولود کی صورت چھری چھپائے پھرتے ہیں

گھروں کی جلد اور اُجڑی دیواروں کے چمڑے سے
سوکھی ہوئی زبانیں باہر نکلی ہیں
ایسا حزن جو غم کی ہر نسبت سے جدا ہے

وہ قید نہیں تھی گزرے دنوں کی آگ
ہوس کی دلجوئی سے اور بھی کچھ بھڑکی تھی
جس سے کنارا ممکن نہ تھا

دل کو چُرانے والے اپنی ہی آواز کی
سچائی سے خائف، چُپ تھے
چاقو سے دیوار پہ خط کو کھینچ رہے

جھینپ رہے تھے یا پھر ہانپ رہے تھے
پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا
سپنا تھا یا خواہش کی بدنظمی اس کا پھیلا ہراس

شہر کے گرداگرد جو باڑ ہے اس تک
ساری دوڑ رہی، قدم قدم ہر ٹوٹنے والے خواب
سے دل مسوس رہے

لقمہ لقمہ ایسے سجا کے رکھا
جیسے یہ خوراک نہ ہو
پانی سے نکلا زیور ہو

ہر بار اعانت کا طالب ہوں
ہر بار میں دست و چُپ کے پُتلوں کو
سخن کی گرمی سے بھرتا ہوں

گھڑی کا دستِ ساعت
ہر تحریر کی اِملا کے اعراب مٹائے جاتا ہے
تحریریں روندے سبزے کی اُکتاہٹ کی باس لیے ہیں

ہر بار حکایت ہم سفری کے دعووں پر
دستِ تعاون مانگتی ہے
ہر بار میں اونچا سننے کی مجبوری سے

نیم دلانہ ہامی بھرنے والی گردن کی حرکت سے
ایسے سر کو ہلاتا ہوں
جیسے کہانی سے باہر ہوں

زندہ ہوں اور موت کے بارے میں سُن سُن کے
بے حال نہیں ہوں
نہ کھانا پینا ترک کیا ہے

گو پیروں سے نہریں نکلیں نہ در بدری
نہ خوں سے کرامت کے اوزار
نہ لفظوں کی گندھک سے آگ

مٹھی بند کیے سونا ہے
اس میں جگنو ہے یا سکّہ ہے یا سونا ہے
میرے ساتھ ہی ایندھن ہونا ہے

دنوں میں قید صدا

دنوں میں قید ہفتوں اور مہینوں کی صدا
جو منہدم ساعت میں تارے کی طرح چمکی
بدن کی تیلیوں کو آگ دکھلاتی ہوئی

اک گونج سے میرا سراپا کھل کے واضح ہو گیا
اک حالتِ ایجاد جو ہر شے کو دھنتی ہے
سوالوں کے بدن کو چھید کر ان پر جھکی ہے

صبح کے پیالوں میں شب کی تلخ آگاہی کے قطرے
اک خلا ناراضگی کے پر سمیٹے منجمد ہے
آئنے بے ضابطہ رقاص اور چہرے کی گھڑیاں

زائچے اور دائرے پورے ادھورے نامکمل
عکس اور معکوس شکلیں ذہن کی دیوار پر
جو بے ارادہ خواب کی تحریک سے منسوب ہیں

گنتی کے سب اعداد بے مصرف ہوئے
انکار اور منکر کے معنوں کے تصرف سے
تہی کیسہ ہوئے

وہ پالتو الفاظ ابجد کے جو ٹھنڈی راکھ کی صورت گرے
اور گلیوں میں جم گئے، جو بے حسی سے اپنے
رمز و راز کی لایعنیت کی کھوج میں پتھرا گئے

ہر طرف معدوم بشرے، ہر طرف اس روشنی کا اندھا چھڑکاؤ
جسے سب سیم و زر کا روپ یا دلدل کہیں
یا حسن و خوبی کی تواضع کے لیے سیڑھی کہیں

ہر طرف اب درد کی اس ٹمٹماتی لَو کی دھیمی آنچ سے ہم منفعل
اور مشتعل ہیں، اپنے دل کی چار دیواری کے کچے گوشت کو
پھر ناخنوں سے چھیلتے ہیں

اس کی تلخی کرب کو محسوس کر کے جسم و جاں میں گھولتے
مجذوبیت کا روپ دھارے قطرہ قطرہ زہر کو ہم چوستے
اور پھر تماشے کی طرح سب کچھ لٹا کر پھر رہے ہیں

خود میں زائل آس کی ترویج کا الزام ہو یا پھر ملامت
یاوہ گوئی ہو یا اپنی خودنمائی کا بھروسہ
حزن بھی تشہیر ہے

یہ پالتوغم بھی زرِ خالص ہے نقدی کی طرح
عاشق بھی گویا بیسوا جس کی خوشی یا غم نمائش ہے، جو اپنے
دل کے گہرے داغ کی تہ تک پہنچنے کے لیے جرأت نہیں پاتا

مگر میں آگ ہوں میری زباں جلتے بدن کو چاٹتی ہے
لمس کو اور ذائقے کو، ہوش کو نابود ہونے کی تہوں تک
آسماں کے ناروا سخنوں کو اور تنبیہ کو

اور کبھی روپوش گونگے مسخروں کی شکل
اپنے ذہن کے اس بے توازن آئنے میں جھانکتے ہیں
جیسے المیہ اور طربیہ کے درمیاں بھٹکے ہوئے ہوں

یہ کھیل تھا لیکن مراتب کے مدارج تھے
جو چھانتے اور چھانٹتے تھے، ہر نئی ترمیم سے
گھیرے کو تنگ اور دائرہ محدود کرتے تھے

جہاں پر میرے جسم و جان کی بازی لگی ہے
بددلی سے پانسہ پھینکا جا رہا ہے
بے دلی سے مجھ کو ہارا جا رہا ہے

دنوں میں قید ہفتوں اور مہینوں کی صدا کی سیٹیاں ہیں
جیل خانے کے الارم کی طرح جو جاگنے کو چمچیوں سے بانٹتے ہیں
نیند کو دارو ملی راحت کی صورت سینچتے ہیں

غزل کے مصرعے جیسا

غزل کے مصرعے جیسے مصرعے کو لکھنے کا سودا
جس میں بات مکمل ہو، جو اپنے آپ میں کافی ہو
حسنِ بیاں اور حسنِ ادا میں ایک توازن
ایک سلیقہ
کچھ ابہام کا جھنجھٹ نہ ہو
نہ ہی فکر کی گہری چوٹ
نہ دور کی کوڑی لگنے والی تشبیہیں ہوں
مفرد شعر کی ایسی اکائی
جس میں معنی اور الفاظ کا اوسط
صاف اور واضح بوجھ نہ ہو
کسی شہادت کسی گواہی کی خواہش نہ ہو
کسی بناوٹ اور سجاوٹ سے معذور
ہمت کر کے لکھنے کی حد تک
دل سے سرگرداں رہے ہیں

اور اب یہ حاصل یہ لا حاصل ہے
تسلّی کے الفاظ بھی ایسے گنجلک ہیں
جن کے واضح گوشے بھی پوشیدہ
اور متروک لغت سے وابستہ ہیں
خود کو ہی الزام دیے جانے سے چھٹکارے کی
ہر رہ اب مسدود ہوئی ہے
تحریر کے ہر فقرے کے آگے
بند گلی کا دروازہ ہے
نظمیں ایسی بھول بھلیاں
جن میں موتی ہیں نہ آنسو اک سنگین خلا
جن کو ڈھونڈنے نکلے تھے
اُن کو چھوڑ کے آگے آ نکلے ہیں
مصرعے کی ترتیب سے دنیا کی ترتیب کی
فال نکالی تھی، اب دونوں کو رعشہ ہے
دنیا شعر نہیں تھی گو کہ اس میں خواجہ سرا کا
روپ لیے وارد تھے
جتنا مل مل مصرعوں کو دھوتے تھے
اتنے ہی وہ ہلکے ہو کر
شُہدے پن کی سرخی سے بدنام ہوئے
ان کی مَیل سے دامن تو مَیلا تھا
منہ بھی کڑوا ہے

اُگلے جانے والے لفظوں کو ہم نگل گئے
اور نگلے جانے والے لفظوں کو ہم اگل رہے
خود سے کہتا ہوں کہ اب بھی موقع ہے
اپنا یہ مفروضی دسترخوان لپیٹوں
اس پس خوردہ اور بقایا کو
آگ دکھانے سے پہلے میں پاک کروں
کوئی جنتر کوئی منتر
جو اس کے سر کی بلا کو ٹالے
جس آسیب نے گھیرا ہے
جو وشواس رقیق القلبی سے
مجروح ہوا ہے
اس پر پھر سے غور کروں
کیا کہنا تھا کیا کہہ بیٹھے
کون اس رمز و راز کی ٹوہ لگائے
اتنی جلدی کیا تھی
کس سے آگے بڑھنا تھا
یہ کوئی شرط نہیں تھی
ہار اور جیت کا کھیل نہیں تھا
ہاں لمبی فرصت تھی اور کم کم فاقے
دھیرج رکھ کر چیزوں کے چہرے کی
ٹھنڈک گرمی اور تبسم

خود میں اترنے دینا تھا
ایسے ہاتھ چلائے ایسے باڑ
پھلانگ کے نکلے
جیسے کوئی دس آنکھوں سے دیکھ رہا ہو
اب جب ضعف نے دامن پکڑا ہے
اور اکھڑی اکھڑی نیند میں ہلکی کھانسی سے بے حال
دوا کی شیشی پکڑ رہا ہوں
منہ سے جو کچھ باہر آتا ہے
اس کا وصل کتابوں سے ہے
اوروں کی تحریروں سے
ان کے ہی امکان کے آگے بڑھنے کے انداز
ان کے ہی انجام کی رقت
میرے آگے ہے
اتنے ضائع اثاثے کا ضامن ہوں
آندھی آئی جھکڑ آئے نہ سیلاب
پھر بھی اپنی جڑوں سے اکھڑ گیا میں
کیا سلاست، کیا روانی، کیا تکلف
نہ تشدید نہ تجید
ایسا کچھ ٹوٹا ہے جس کا شور تو ہے
کہ جس کی شکل نہ اپنوں جیسی ہے
نہ ان سے ملتی جلتی ہے

ایک اُدھار جو ضبط کی صورت

اس کا آخری داؤ ہے

اپنے چمن کو خود تخلیق کیا ہے

اس میں پھول اور کانٹے جھاڑ

سبھی کچھ ہے

رشتوں کو اجناس کی شکل سنوارا

اور تولا ہے

اب بے پروائی سے کونے میں بیٹھا

مال کے نہ بکنے کے اندیشے سے فارغ

مٹی پر الفاظ کی صوتی قوسوں کی

تصویر بناتا رہتا ہوں

انہیں مٹاتا رہتا ہوں

آخری دن سے پہلا دن

میں ضائع ہو گیا حالانکہ اس میں کوئی خود نمائی نہیں تھی
پتھر جو تھے وہ زمیں پر پڑے رہے اور شیشے کے گلاس

نیند نہیں تھی کیونکہ جوانی کے چار دن تھے، دلداری حرص کی طرح تھی
اور اُنڈی پڑتی تھی

وہ دیودار ہو یوکلپٹس ہو یا بوگن ویلا، ان سے مفاہمت کی کوئی
جلدی نہ تھی، کیونکہ میں خود مٹی میں پیوند ہو چکا تھا

تیری باتوں سے محسوس ہوا رات کے پتوں کو کتنی آکسیجن چاہیے
اداس کے نامے ان کو کیوں نہیں آتے

میں چلتا رہا اور جنتری کے ورق اک اک کر کے بُجھ گئے
لوگوں کے مکدر چہروں کی جھنجھلاہٹ ان کو زندہ رکھنے کا سبب تھی

میں ضائع ہوگیا کہ میں نے انگوروں کی بیل لگائی اور اس کو پانی نہ دیا
اور منہ کی بھاپ سے خشک سالی بھی تو شکوہ نہ کیا

تمہارے گھر اور قبرستان کے بیچ جو تھوڑا سا تاریک راستہ تھا اسی تاریکی
اور تنہائی میں میرے ہاتھ تمہیں بچھوؤں کی طرح کاٹتے تھے

اور عجلت میں لیا گیا ایک ادھورا بوسہ، کاڑھی ہوئی شال کی طرح
جس کے پھولوں کو خوراک سمجھ کر کھا لیا گیا ہو............

موت کی خنکی اور ریل کی پٹڑی کی ٹھنڈک دونوں ہم جنس ہیں، لیکن جن کو
گھروں سے نکال کر برہنہ کرکے برف کے اوپر لٹایا گیا

اور اندھیری کوٹھریوں میں ناخن اکھیڑے گئے اور ذبح کرنے سے پہلے
ریپ کیا گیا، ان کو بھی تو کوئی خدا دیکھتا ہوگا

منصفی بشریت کو وجود عطا کرتی ہے، یہ سامری کا بچھڑا اور اس کی
گائے کی آواز نہیں ہے، نہ کوئلوں پر چلنے سے کچھ حاصل ہوتا ہے

میں ضائع ہوگیا کہ مجھے یقین دلانے والوں نے کروٹ بدل لی
اور اعتبار کے سکوں کو چھین لیا

میرا مرنا اک عہد کی موت نہیں ہے کیونکہ وہ تو پہلے ہی مر چکا ہے
اس کی سڑاند سبزیوں اور پھلوں میں سرایت کر چکی ہے

یہ آخری دن سے پہلا دن ہے، اور یہ ہی آخری تسکین ہے
یہی میری شب باشی کا پیالہ ہے

پھول کھلے ہیں

پھول کھلے ہیں
آنکھیں مدہوشی میں دیکھ رہی ہیں
گویائی سے زائد حلقے خاموشی کے

نسلوں کی وہ پیاس اور اس کی کڑواہٹ
منہ پر جالا بن کرتی ہوئی ہے
اندر وہ تنہائی جو اُبکائی بن کر
پیٹ سے تالو تک گردش کرتی ہے

خبروں کے بھرپور شکم کے ساتھ لدی
وہ سال و سن کی نوکائیں، ہوش
جو ہاتھوں کے ملنے سے چنگاری کی صورت
اک لحظے کو بھڑکا تھا

نیند نہیں ہے کوئے سگاں کا ہمسایہ ہے
رات نہیں ہے پہرے پر افیون زدہ کُتے ہیں

سوچ رہا ہوں ٹھوکر ہوں میں، رستہ ہوں یا جھاڑی ہوں
یا ان کے اوپر گردش کرنے والی
ہر تدبیر سے جڑا ہوا بہلاوا ہوں

باغی کی رومان بھری دنیا کے پھیلاؤ میں گم
دو کوس چلا اور ایک دہائی پاؤں کے نیچے روند گیا
گھر کے نسائی رشتوں کی تلوار جو کھینچی
نصف صدی کی کُہنہ عمارت مجھ پر آن گری

شہر جو گلتے جسموں کی دلدل میں حکمت ڈھونڈتا ہے
عفریت ہے
جو صدیوں سے پاکیزہ نیند کو اوڑھے
سرمایے کی کھال چبا کر فربہ ہے

میں باغِ عدن کا واحد کانٹا
اپنی یکتائی پر جتنا پھولنا چاہا
پھول چکا ہوں

اب شیشے میں ناراضی کی تصویر بنا
شیو کے اکڑے بالوں سے کیڑے چنتا ہوں
آنکھیں پیتے ہیں جو رتھ سے جدا ہوئے ہیں
اس دوڑ کے آخر میں جو فیصلہ کن ہے

نامردی کا عذر بہانہ ہو تو ہو
کوئی بجھارت کوئی گرہ نہیں تھی
کیوں پھر خود کو سانپ کی صورت کاٹا
اپنوں کو بھی

تنہائی کا رونا روتے روتے دنیا کو لٹنے کو چھوڑا
اس منظر کو فلموں کے منظر کی صورت
اونگھ میں اور بے جذبہ نظروں سے دیکھا

اور مزاحمت جو حرفوں کی روداد سے پیدا ہے
اور بیاں کے جُملہ مدارج طے کر کے وہ لغو نہیں ہے
پر لغوی حد تک معنوں کی ترسیل سے عاجز ہے

جیسے میں عاجز ہوں
لفظوں کو کھِلواڑ کی حد تک بُنتا ہوں
طشت کے اوپر

ان کو سینت کے رکھتا ہوں
جیسے نو مولود کی لاش
کو پھل اور میوے سے ڈھانپا ہو

کفر کی حد تک اپنی پیاس ٹٹول چکا ہوں
پیاس کہ جس میں دنیا کی یہ بھوک بھی شامل ہے
بھوک کہ جو ترغیب ہے
تازہ خون اور گوشت پہ پل پڑنے کی

ملبوس میں ہوں یا بے ملبوس
نکتہ چیں یا شاکی
اس چہرے کا ایک ہی رُخ ہے
جو تشدّد کی طرح کی یکسانیت سے مملو ہے

مدہوشی ہی میں عافیت ہے، دانائی ہے
دل کو خزاں کے بیجوں میں دفنایا ہے
ایسی زمیں جو ہر فریاد سے بے پروا ہے

یہ رات گزرنے کو......

یہ رات گزرنے کو گزر جائے
یہ رات شجر ہے نہ سفینہ
جو ماتمی جذبوں کی گرانی کو پنہ دے

اوراقِ خزانی کی طرح یاد سے معمور
یہ زخم عزاداری کے موسم کی طرح
خود کو کُھرچتے ہیں

افسانوں کے کردار یا افسانوں کے راوی
پہچان کے اس لمحے سے وابستہ گریزاں
لایعنی اندھیرے میں گرے ہیں

یہ گھور سیہ رات، امید کی وہ کاٹی ہوئی فصل
کھلیان میں راندہ ہے مگر جاں کو
سہارے کی طرح چمٹی ہوئی ہے

وہ بارِ گراں یعنی ضیافت کے وہ ٹکڑے
غم اور خوشی، دونوں رفیق اور حلیف
رستے کی بجھارت سے بھرے ہیں

اک عرضِ ہنر جسم کی شوریدہ سری
اس کی بلوغت کے فسانوں کو
زباں دیتا رہا ہے

یہ رات گزرنے کو گزر جائے مگر اس کی جڑوں میں
کوئی آنسو نہ دفینہ
اک موت سا خاموش سکوں اس کا قرینہ

شہر اور دروازے

شہر کے سب دروازے بند ہیں اور جھروکے روشندان
ازلوں والی مٹی اپنے باطن کے سب راز اُگل کر ٹھنڈی ہے
آنکھیں اپنے بت کی پرستش سے آزاد نہیں، آزار میں ہیں
گھر کی پرانی تلواروں کی تیز چمک سے سہمے سہمے
رن کے ہر میدان سے ہم مفرور ہوئے ہیں
چقماق کے گھسنے کی آواز ہے یا پھر دل کی گھنٹی کی
یا ٹیبل واچ کی ٹِک ٹِک
ان سے ہراساں آنکھیں ملتے اُٹھے ہیں
گھوڑا ہو یا فیل ہو یا پھر پیدل ہی
چمکارنے والی موت کی جانب لپکے ہیں
دیواریں پُرآب نہیں ہیں نہ ہی رستہ چھوڑ رہی ہیں
اک اندھا پن جو کوشش اور خراش کی صورت چبھتا ہے
وہ پیڑ نہیں ہے اپنی ذہنی شاخوں کا پھیلاؤ
ہوش سے پھسلا بے ہوشی کا استدلال

لفظوں کے شب خوں سے جو تقویت پا کر پھول رہا ہے
نیند مسافر یا خیمہ ہے یا مجبوری یا پھر عجز
یا سوغات جو بانٹے جانے سے بڑھتی ہے
یا روندی جانے والی باڑ
منظر کی فاضل آکسیجن چوس رہا ہوں
مجھ میں اب کوئی ڈنک نہیں ہے
مدت سے میں اوّل شب کی دلہن کے تمثال
اک گہرے لمبے بوسے کی امید لیے
منہ پر ابٹن مل کر
کپڑوں کی مضبوط گرہوں کو کھولے
سوتا ہوں نہ جاگ رہا ہوں

بے خوابی ہے میں ہوں

بے خوابی ہے، میں ہوں اور بارش ہے
اندیشوں کے زہریلے پن میں
چبھنے والا خنجر یہ تنہائی ہے
موت کی بھرپور کشش ہے نسوانی سانسوں میں
اندھیارے میں مے کی گرمی سر کو چڑھتی ہے
ہاتھ ٹٹول رہے ہیں کپڑا الٹا جسم کا کونا
فرنیچر کی تیز مہک جو مدہوشی کی جانب
اور دھکیل رہی ہے
آنکھیں دیکھنے کی حد تک بینا ہیں
جاں کے ارزاں نذرانے سے تم کو چھونا
کسی پرانی ریت روایت کے مصداق
تم میں داخل ہونا، تم میں چھپنا اور لپٹنا
ہر حصے کو مجنونانہ بوسے سے بپتسمہ دینا
تم اک جسم ہو جیسے میں ہوں زندہ، ثابت، معمولی

الجھن سے تکلیف سے شکوے سے بھرپور
اپنے خالی پن کی تاریکی کے ہول سے لرزاں
پھر بھی کیوں لگتا ہے تیرے پہلو سے میں اُگلا گیا ہوں
خالی خالی نظروں سے تکتا ہوں
تم کو تیرے اترے ہوئے کپڑوں کو
پانی کے کوزے کو، آدھے کھائے بن کو
تسکین کی خواہش تو خواہش ہی رہتی ہے
پل بھر میں ہم کتنے چھوٹے ہو جاتے ہیں
جیسے کسی نے آنکھوں سے بے دردی سے نوچا ہو خواب
بارش کے چھینٹوں میں جو اک سحر رہا اور ہلکی خنکی
ہوش جو اپنی حد سے آگے بے پتوار سا ڈول رہا ہے
اک لحظے کی یا لمحے کی جنّت تھی
جب ذہن سے مطلع صاف ہوا
نہ نیند رہی نہ خواب رہا نہ ہاتھوں میں حساسیت
تم کو گھر جانے کی جلدی ہے، اور میں رکشے میں
اک رسمی بوسہ لے کر الٹے قدموں تیزی سے چلتا ہوں
جیسے بوجھ تھا جس سے ہلکا ہو کر آیا ہوں

لا- لایعنی

تیرہ کا ہندسہ منحوس ہے
شاعر نے کہا
مرد اور گھوڑے کے پاؤں پیٹ میں ہیں
اور فاختہ تیرا خاوند گھر نہیں آئے گا

یہ دو ہزار آٹھ کا دوسرا ہفتہ ہے
اور دنیا کے منہ پر تھپڑ پڑ چکا ہے
بھاری بوٹ طبل کی طرح اوندھے پڑے ہیں
محبوبائیں نرسوں کی طرح بدن ٹٹولتی ہیں

نیند میں بغل گیر ہونے کا فائدہ نہیں
جب سب خواب جلائے جانے کے لیے ہوں
جیسے زاہد ڈار نے کہا میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں
جو تمھارے پاس نہ ہو

ووٹ کی پرچیوں پر حیرت انگیز تصویریں ہیں
کوئی بچہ اتنی متنوع چیزوں سے نہیں کھیل سکتا
شکلیں ممنوع جنسی آلات کی طرح تیز ہیں
اور یہ پٹاخے کی طرح پھٹ بھی سکتی ہیں

وہ حملہ کرنے کے لیے تیار تھے
پر مجھے برہنہ دیکھ کے شرما گئے
حالانکہ مجھے مرے ہوئے تیسرا دن ہے
اور آسماں آہ و بکا کے بعد منہ بسور رہا ہے

اور محقق ہیں جن کے پاس تحقیق کے اوزار ہیں
چھ مہینے کا فالتو راشن بھی ہے
وقتاً فوقتاً نظر بازی کی فرصت بھی ہے
پر انہیں فیصلہ سنانے میں کوئی عجلت نہیں

وہ جو تاریخ کی طرح لمبی گردن اور زبان کے نکال کے پھرتے ہیں
اور ہاتھوں کو دستار کی طرح سنوارتے ہیں
یہ سب اطبا کے مشوروں پر چل رہے ہیں
ہمارے ذہنی حیض سے نفور نہیں کر سکیں گے

آج پیر کا دن ہے، آج خداؤں کے ستانے کی باری ہے
آج وہ نہ عرضی لیں گے نہ درخواست
غم کے پرچم چاہے لپٹے رہیں یا کھلے

سب کچھ لٹا کر بہت خوش نہیں ہوں
یادداشت گم ہونے سے ستر اور ستر ہندسے رہ گئے ہیں
موت چاہے سولی سے آئے یا خودکش حملے سے
یا فرماں برداری سے، ایک ضرورت ہے جو پوری ہونی ہے

لکھے ہوئے لفظوں کے سراپے کو برہنہ کر سکتے تو کر دیتے
پر کاغذ کی کشتیوں کا سفر دور تک جاری نہیں رہ سکتا
ڈوبنے والے کے لیے ولادت کوئی رستہ نہیں
جنسی غدود دبانے سے بھی روشنی ہو سکتی ہے

میرے سر میں جو طوفان تھا وہ تھم گیا ہے
اور بغاوت کا زہریلا غبار جو منہ سے نکل رہا تھا
خود سے رومان یا دلجوئی کی عادت کا میلان تھا
اور آخر اس بت کو ٹوٹنا ہی تھا

ایک بلیک ہول ہے جس میں قید ہیں
اور اپنے پاپوش اٹھائے کرفیو میں نرمی کے طالب ہیں

دن اور رات کے بدلے ہوئے تیور سے مایوس
اپنے اندر گرتے ملبے کو نسوانی حسن کہہ کر چمٹ گئے ہیں

سوچنے کے لیے اب کچھ نہیں ہے
ہر مقدس چیز کے عقب کا خلا گھور رہا ہے
کرنسی نوٹوں کی چھاتیاں پھولی ہوئی ہیں
ہاتھ انہیں سہلانے کے لیے بڑھ رہے ہیں

دنیا بحری قزاقوں کی آماجگاہ ہے
اور لوٹ مار کے لیے حجّت کی ضرورت نہیں
یہ شاعری نہیں ہے
جو مٹی کے پتلوں کو پکانے سے پیدا ہوتی ہے

دلالوں کی منڈی کے منصب دار کے آگے جھکے ہیں
ان کے ناموں کو تھوک سے چمکائیں یا پیٹھ پر رگڑنے سے
ریپ کے لیے بھی آپشنز ہیں
اور کچھ اجرت پر بھی مل سکتے ہیں

مشین گن ہے توپ ہے گولہ بارود ہے
ان کی گفتگو سے دستر خوان سجا ہے
یہ ہمارے نئے خاوند ہیں
شرعاً بھی ان سے مجامعت حلال ہے

اور وہ آخری ڈایابیٹک بوسہ
تیری چھاتیوں پر جھکنے سے پہلے
پاؤں کے ورم کو ملتا ہوں
اپنا شوگر لیول چیک کرتا ہوں

میں دنیا کے دروازے کے پیچھے کھڑا رہا
آنکھیں پھیل پھیل کر چیزوں میں کھبتی رہیں
ہاتھوں سے حس معدوم ہوئی، لفظ بے کار
صرف ٹھٹھرنا باقی رہ گیا

دوسری منزل، مفتی بلڈنگ، 17/31 ٹیمپل روڈ، لاہور
فون: 042-7355323 فیکس: 042-7323950
ای میل: sanjhpk@yahoo.com